تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اُردو

منتخب شاعرات کی آپ بیتیوں میں ادراک ذات کا مطالعہ

بحوالہ خصوصی: ادا جعفری اور کشور ناہید

محقق:

لبنیٰ نفیس

230-FLL/MSURDU/F17

نگران:

ڈاکٹر غلام فریدہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

شعبۂ اردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی اسلام آباد

International Islamic Univ.
CENTRAL LIBRARY ISLAMABAD

Accession No. ~~II~~ 94871 ٩٧١

MS
821
ل ب ح

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **LUBNA NAFIS**

Title of the Thesis: منتخب شاعرات کی آپ بیتیوں میں ادراک ذات کا مطالعہ بحوالہ خصوصی ادا جعفری اور کشور ناہید

Registration No: **230-FLL/MSURD/F17**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Humaira Ishfaq
Chairperson,
Department of Urdu, Female, IIUI

External Examiner:

Dr. Abdul Aziz Sahir
Head
Deptt. of Urdu, AIOU
Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Shiraz Fazal Dad
Assistant Professor
Department Of Urdu, IIUI

Supervisor:

Dr. Ghulam Farida
Assistant Professor
Department Of Urdu, IIUI

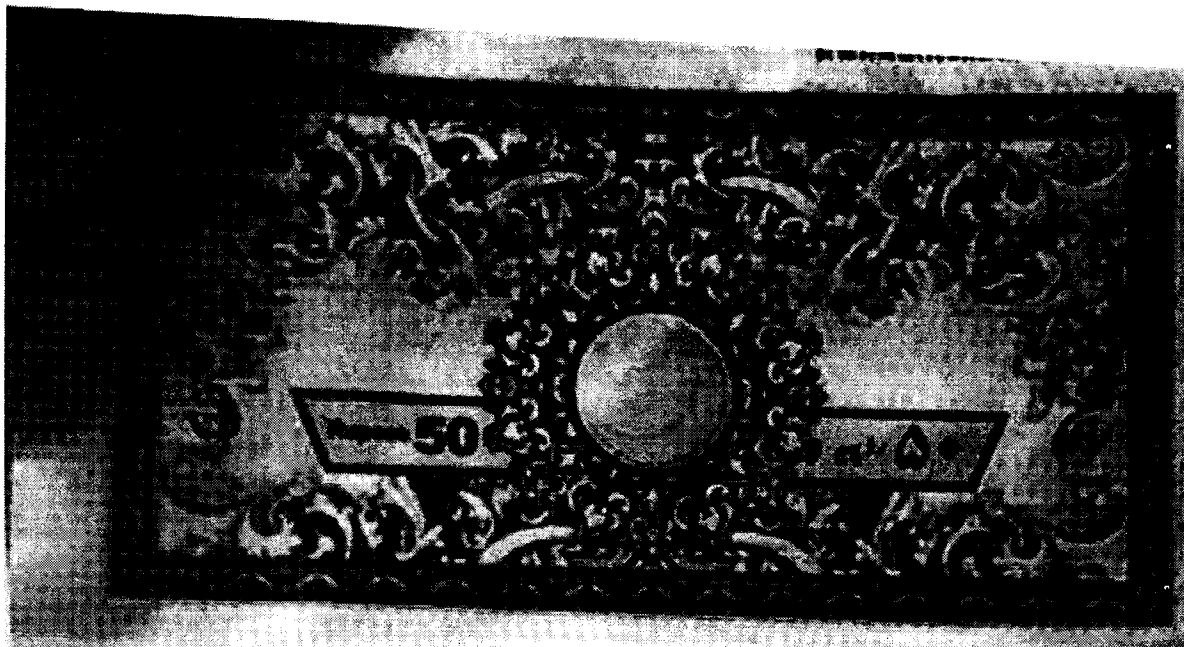

Rupees 50 روپے ۵۰

بیان حلفی

منکہ مسماۃ لبنیٰ قیس دختر محمد حنیف شہزاد رجسٹریشن نمبر: 230-FLL/MSURDU/FALL-17 حلفیہ بیان دیتی ہوں کہ میں نے اپنا تحقیقی مقالہ بعنوان (منتخب شاعرات کی آپ بیتیوں میں ادراکِ ذات کا مطالعہ بحوالہ خصوصی ادا جعفری اور کشور ناہید) برائے حصول سند ایم۔ایس ڈاکٹر غلام فریدہ کی زیر نگرانی میں اپنی محنت سے تحریر کیا ہے۔ یہ مقالہ سرقے سے پاک ہے اور اس میں تحقیق و تنقید کے اصول و ضوابط کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ نیز اس سے پہلے یہ کسی جامعہ میں برائے حصول سند پیش نہیں کیا گیا۔ اس میں شامل تمام حوالہ جات کا اسناد موجود ہے۔ اور میں اس مقالے کی تمام نتائج تحقیق کی ذمہ دار ہوں۔ مندرجہ بالا میں جو کچھ کیا گیا میرے علم کے مطابق بالکل صحیح و درست ہے اور اس میں کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی گئی۔

المرقوم 23-08-2021

دستخط: ______

نام: لبنیٰ قیس

والد کا نام: محمد حنیف شہزاد

37406-0795517-2 CNIC

گواہ:

دستخط: ______

نام: عارفہ ریاض

والد کا نام: سید ایوب ...

61101-9394728-6 CNIC

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ لبنیٰ نفیس رجسٹریشن نمبر 230-FLL/MSURDU/F17 نے ایم۔ایس۔ اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان **"منتخب شاعرات کی آپ بیتیوں میں ادراکِ ذات کا مطالعہ بحوالہ خصوصی: ادا جعفری اور کشور ناہید"** میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

Gulam Farida

نگران: ڈاکٹر غلام فریدہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

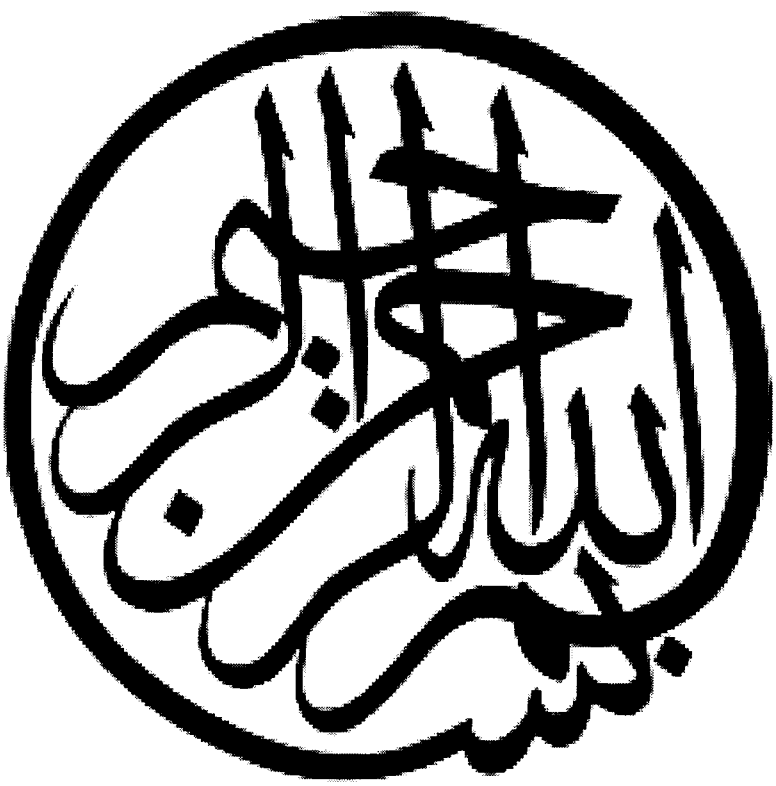

پیش لفظ

دنیا کی ہر زبان میں آپ بیتی اہم صنف کے طور پر موجود ہے۔ آسمان کے نیچے اور فرش خاکی کے اوپر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت زندگی ہے۔ زندگی محض آتی جاتی سانسوں کا نام نہیں ہے بلکہ یہ انسانی اعمال وافعال، اخلاق و کردار ،عادات واطوار، نشست و برخاست سے لے کر جسم و روح اور قلب و ذہن کی ساری کثافتوں اور لطافتوں کی داستان ہے۔ انسان اس دنیا میں ایک ہی بار آتا ہے اور اپنے حصے کا کام کر کے چلا جاتا ہے۔ اس دنیا میں اپنی الگ شناخت ہر انسان کا خواب ہے۔ انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی اس کا نام زندہ رہے۔ حیات جاوداں کی فطری خواہش انسان کو آپ بیتی لکھنے پر اکساتی ہے۔ مگر آپ بیتی لکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس میدان میں وہی شخص طبع آزمائی کر سکتا ہے۔ جس نے اس دنیا میں کوئی نمایاں کام سرانجام دیا ہو۔ فنی محاسن سے آراستہ آپ بیتی کسی ایک فرد کی داستان حیات نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک عہد کی تاریخ و تہذیب کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اسی لیے آپ بیتی کا موضوع اپنی جامعیت، وسعت اور اہمیت کے لحاظ سے کم حیثیت کا حامل نہیں۔

یہ تحقیقی مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں آپ بیتی کیا ہے ؟ اردو ادب میں آپ بیتی کی روایت اور اس سلسلے میں مختلف ماہرین کی آراء کو شامل کر کے خود نوشت کی جامع تعریف پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو کی پہلی آپ بیتی کالا پانی اور چند مشہور آپ بیتیوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ جن میں ان کی زندگی، خاندان، مزاج اور ماحول پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ خواتین کی آپ بیتیوں میں ادراک ذات کے حوالے سے جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کی آپ بیتیوں میں ان کی شخصیت، نظریات زندگی کے لائحہ عمل سے آگاہی کے ساتھ ساتھ اس دور کے تہذیبی، سماجی ،سیاسی، ادبی اور ثقافتی منظر ناموں کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں خواتین مصنفین کی آپ بیتیوں میں معروضی رویوں اور انفرادی تشخص کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ خواتین کی تعلیم پر توجہ دینے سے تعلیم نے نا صرف ان خواتین میں انفرادی تشخص کو ابھارا بلکہ انہیں سماجی فلاح کے لیے جدوجہد کرنا بھی سکھایا۔ اس عہد میں عورت کو اپنے حقوق کے لیے کن کن مشکل مراحل سے گزرنا پڑا اور معاشرے میں خواتین کو کن کن معروضی رویوں کو سامنا کرنا پڑا کا جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں دو اردو شاعرات ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں عورت کے معروضی رویوں اور انفرادی تشخص کے اظہار کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ معاشرے کی طرف سے عورت کو جن خاص رویوں اور بے جا پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور ان پابندیوں کو قبول کر کے ہی عورت معاشرے کے لیے قابل قبول ہو سکتی ہے ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ عورت کو ایک انسان کی بجائے بے جان شے سمجھنا اور اس کی کسی بھی خواہش کو اہمیت نہ دینا اسے ناقص العقل جان کر کسی بھی معاملے میں شامل نہ کرنا انہی معروضی رویوں کو جھیل کر عورت اپنا انفرادی تشخص کیسے قائم کرتی ہے۔ ان رویوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب چہارم میں ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں بطور عورت سماجی رویوں کی پیش کش کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ جس میں اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ عورت کے متعلق معاشرے کا مجموعی نقطہ نظر کیا ہے۔ معاشرے میں عورت کی ذات کن کن مشکلات سے نبرد آزما ہوتی ہے۔ مقالے کے آخر میں ماحاصل ہے۔ ماحاصل کی ذیل میں تمام حاصلات تحقیق کا نچوڑ بیان کیا ہے۔

اس مقالے کی تکمیل کے لیے سب سے زیادہ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی کی وجہ سے میں مشکل ترین مراحل سے گزر کر مقالے کو تکمیل کے مرحلے تک لا سکی ہوں۔ میں اپنی انتہائی قابل احترام استاد محترمہ ڈاکٹر نجیبہ عارف صاحبہ کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ جنہوں نے مقالے کے موضوع کے انتخاب کے سلسلے میں میری مدد کی۔

میں اپنی نگران مقالہ ڈاکٹر غلام فریدہ کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں، جنہوں نے ہر ممکن طور پر میری رہنمائی اور مدد کی۔ ڈاکٹر غلام فریدہ کا مشفقانہ اور محبت سے بھرپور رویہ اس مقالے کی تکمیل میں کار گر ثابت ہوا۔ جس وقت جس لمحہ ان سے رہنمائی کی طلب کی انہوں نے بھرپور معاونت کی۔ میں ان کی بہت شکر گزار ہوں۔ اس کے علاوہ میں اپنے شعبہ اردو کی تمام اساتذہ کی شکر گزار ہوں۔ جنہوں نے کسی نہ کسی طرح سے اپنی مفید معلومات سے مجھے بہرہ مند کیا۔

میں اپنے شریک حیات ذیشان قادر کی شکر گزار ہوں، جنہوں نے مقالے کے ابتدائی مراحل سے لے کر اس کی تکمیل تک میرا بھرپور ساتھ دیا۔ مقالے کی ٹائپنگ کا مرحلہ جو میرے لیے مشکل ترین مرحلہ تھا اس میں میرے اپنوں نے جن میں فضہ، لائبہ، انعم، تسنیم نے میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ میں اپنی بہنوں عظمیٰ نفیس، علیزہ نفیس اور بھائی محمد سہیل اختر، علی عمران، علی رضوان اور بھابی سلمہ کی بھی شکر گزار ہوں۔ اپنے بیٹے محمد اذلان قادر کی بھی شکر گزار ہوں۔ سب سے زیادہ شکریہ کے حقدار میرے والد (محمد حنیف شہزاد) ہیں جن کی دعاؤں اور کاوشوں کی بدولت میں آج اس مقام تک پہنچی۔ جن کے اصرار اور کاوشوں کی بدولت میں نے ایم فل میں داخلہ لیا تھا۔ ان کے بنا میری ذات ادھوری ہے۔ میں اپنے تمام احباب کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے کسی نہ کسی لحاظ سے میری معاونت کی۔

میں اپنا مقالہ اپنی والدہ (مرحومہ رضیہ بی بی) کے نام کرتی ہوں، جن کی دعاؤں کی بدولت میں یہاں تک پہنچی ہوں۔

لبنیٰ نفیس

اگست ۲۰۲۱ء

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	مقدمہ	
۱۔	**باب اوّل:**	
	اردو آپ بیتی کی روایت	۱
	حوالہ جات	۲۳
۲۔	**باب دوم:**	
	خواتین مصنفین کی آپ بیتیوں میں معروضی رویوں اور انفرادی تشخص کا مطالعہ	۲۴
	حوالہ جات	۴۳
۳۔	**باب سوم:**	
	اردو شاعرات کی آپ بیتیوں میں معروضی رویوں اور انفرادی تشخص کے اظہار کا مطالعہ	۴۵
	حوالہ جات	۷۵
۴۔	**باب چہارم:**	
	اردو شاعرات کی آپ بیتیوں میں بطور عورت سماجی رویوں کی پیش کش کا مطالعہ	۷۸
	حوالہ جات	۱۰۲
	ماحصل	۱۰۵
	کتابیات	۱۱۲

باب اوّل:

اردو آپ بیتی کی روایت

باب اوّل:

اردو آپ بیتی کی روایت

آپ بیتی کیا ہے؟

آپ بیتی اردو ادب کی نثری صنف ہے جس میں مصنف اپنی زندگی کا احوال خود اپنی زبانی بیان کرتا ہے۔ آپ بیتی کی ترکیب اپنی ساخت کے اعتبار سے دو الفاظ "آپ" اور "بیتی" کے اتصال سے بنتی ہے۔ معنوی اعتبار سے آپ بیتی وہ صنف نثر ہے جس میں مصنف اپنی ذات پر بیتنے والے حالات و واقعات بیان کرتا ہے۔ گویا آپ بیتی اظہار ذات کے لیے وجود میں آتی ہے۔

محسوسات کی اس دنیا میں انسانی زندگی میں بے شمار ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو انسانی شخصیت پر اپنے دائمی نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ واقعات نہ صرف ایک انسان کی زندگی پر بلکہ اس خاص عہد پر بھی اثرات مرتب کرتے ہیں جس میں وہ شخص جی رہا ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ تجربات کسی ایک شخص کی زندگی کا حصہ ہوتے ہیں مگر یہ دوسروں کے لیے بھی کٹھن راہوں میں رہنمائی کا کام دیتے ہیں۔ کوئی شخص جب اپنی آپ بیتی لکھنے بیٹھتا ہے تو وہ ایسے ہی تجربات کو اپنی خود نوشت سوانح عمری میں جگہ دیتا ہے۔ خود نوشت میں زندگی میں پیش آنے والے حالات و واقعات کا ان کی نوعیت کے مطابق انتخاب ضروری ہے۔ لیکن احوال زندگی پیش کرتے ہوئے وقت کا تسلسل بھی قائم رہنا چاہیے۔ ایک واقعے کو آپ بیتی لکھنے والے نے کہاں تک محسوس کیا اور اس کا بیان دوسروں کے لیے کہاں تک مفید رہے گا اس مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے واقعات کو آپ بیتی میں جگہ دینی چاہیے۔ خاص طور پر ایسے حالات کو ضرور پیش کرنا چاہیے جن کے ذریعے ذاتی کردار اور افکار کو سمجھنے میں مدد ملے یا جس سے آپ بیتی لکھنے والے کی شخصیت ابھر کر دوسروں کے سامنے آجائے۔

زندگی گزارنے کے عمل میں انسان جن واردارت و کیفیات سے گزرتا ہے ان کی روداد کا بیان ہی آپ بیتی سمجھا جاتا ہے۔ زندگی گزارنے کے اس عمل میں انسان بہت سے خوشگوار لمحات اور ناخوشگوار حالات سے دو چار ہوتا ہے۔ خوشگوار لمحات کو انسان تصویروں کے ذریعے محفوظ کرنے کے جتن کرتا ہے تاکہ مستقبل میں ان سے محظوظ ہو اور ناخوشگوار حالات و واقعات دوسروں کے لیے مرقع عبرت بن جاتے ہیں۔ انہی حالات و واقعات کا سلیس بیان آپ بیتی ہے۔

Wikipedia انسائیکلوپیڈیا کے مطابق Autobiography کے معنی ہیں:

An autobiography (from the Greek autos, 'self' bios, 'life' and graphein to write; also informally called an

autobio) is a self- written account of one's life. The word "autobiography" was first used deprecatingly by William Taylor in 1797 in the English periodical The Monthly Review, when he suggested the word as a hybrid, but condemned it as "pedantic". However, its next recorded use was in its present sense by the poet Robert Southey in 1809. Despite only being named early in the nineteenth century, first-person autobiographical writing originates in antiquity.[1]

فرہنگ آصفیہ میں لکھا ہے کہ:

سر گزشت، کسی شخص کی زندگی کا حال، کسی عالم خواہ فاضل، خواہ بڑے بڑے کام کرنے والے یا بہادر یا حاکم کے واقعات جو اس کی عمر میں گزرے ہوں۔[2]

فیروز اللغات میں آپ بیتی کے معنی کچھ اس طرح ہیں: ذاتی تجربہ، اپنے آپ پر گزرے ہوئے واقعات، اپنی کہانی، اپنا حال، خود نوشت، حالات زندگی۔[3]

عبدالمجید قریشی آپ بیتی کی تعریف کے سلسلے میں رقم طراز ہیں کہ:

خود نوشت سوانح حیات وہ کتاب ہے جس کے اوراق میں انسان حیات مستعار کے مختلف ادوار کو بلا کسی تکلف اور تصنع کے دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے کہ اس نے کن حالات میں اس جہان رنگ و بو میں آنکھیں کھولیں۔ کس طرح وہ طفل شیر خوار سے لڑکپن کی منزل میں داخل ہوا۔ اس کا زمانہ طالب علمی کیسے بسر ہوا۔ عروس شباب نے کیونکر اسے خوش آمدید کہا۔ زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں نے کیسے اس کا خیر مقدم کیا۔ ان کے ساتھ تلخیاں، محرومیاں اور ناکامیاں کیسے اس کی راہ میں سنگ ہائے گراں بن کر حائل ہوئیں اور وہ کس طرح اس گرداب بلا سے اپنی کشتیء حیات کو بچاتا ہوا نکلا۔ زندگی میں کن آدمیوں سے اس کا سابقہ پڑا اور ان کے متعلق اس کی آراء اور تاثرات کیا ہیں۔ اس زمانہ کا طرز معاشرت اور رہن سہن کیسا تھا اور رسم و رواج کی کیا کیفیت تھی۔ غرض آپ بیتی کے روپ میں ایک دور کی ہما ہمی اور گہما گہمی پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے۔[4]

پروفیسر ڈاکٹر پرویز پروازی خود نوشت سوانح عمری کی تعریف کے بیان میں لکھتے ہیں کہ:

خود نوشت سوانح عمری کی سادہ سی تعریف تو بس اتنی ہے کہ وہ سوانح عمری، جو خود لکھی گئی ہو، بالکل افسانہ کی سہل ممتنع تعریف کی طرح کہ مختصر افسانہ، وہ افسانہ ہے جو مختصر ہو۔[۵]

مدیر نقوش، محمد طفیل نے نقوش کے آپ بیتی نمبر میں آپ بیتی کی جامع تعریف بیان کی ہے۔

آپ بیتی کسی انسان کی زندگی کے تجربات، مشاہدات، محسوسات، نظریات اور عقائد کی ایک مربوط داستان ہوتی ہے۔ جو خود اس نے بے کم و کاست اور راست راست قلم بند کی ہو جسے پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب و فراز معلوم ہوں۔ اس کے نہاں خانوں کے پردے اٹھ جائیں۔ اور ہم اس کی خارجی زندگی کے حجرے میں بھی جھانک سکیں۔[۶]

مولانا ابوالحسن علی ندوی آپ بیتی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

اگر سوال کیا جائے کہ ادب وانشا اور تاریخ وتذکرہ کے اصناف میں سب سے زیادہ دلچسپ، دلآویز، خوشگوار اور شوق انگیز صنف کون سی ہے؟ تو شاید اکثر اہل ذوق کا جواب یہی ہو گا کہ ایک اچھے صاحب قلم اور ادیب کے قلم سے نکلی ہوئی آپ بیتی۔[۷]

ڈاکٹر سلیم اختر نے آپ بیتی کی تعریف اس طرح کی ہے:

آپ بیتی لکھنے والا ایک طرح سے اپنی زندگی پر نگاہ بازگشت ڈال رہا ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ بصورت تحریر وہ گزری ہوئی زندگی کو دوبارہ "بسر" کر رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس عمل میں نفسی آسودگی منہا نہیں کی جا سکتی۔ وہ نفسی آسودگی جس اساس نرگسیت پر استوار ہوتی ہے۔[۸]

آپ بیتی کو خود نوشت سوانح عمری یا آٹو بائیو گرافی بھی کہتے ہیں۔ آپ بیتی یا آٹو بائیو گرافی میں اپنی کہانی خود لکھنے کی شرط ہے جیسا کہ *Oxford Dictionary* میں Autobiography کے ضمن میں درج ہے کہ:

The story of once life written by himself.[۹]

کسی شخص کی کہانی خود اس کی لکھی ہوئی۔

سوانحی ادب میں آپ بیتی اس لحاظ سے ممتاز مقام رکھتی ہے کہ ایک شخص کی ذاتی زندگی کو اس سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ کسی فرد کے ظاہری حالات و واقعات تو ہر کوئی معلوم کر سکتا ہے مگر باطنی کیفیات، نفسیاتی ہیجانات اور قلبی و ذہنی واردات کو دوسرا کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ اسی طرح

آپ بیتی کے ذریعے کسی فرد کی بالکل حقیقی اور سچی تصویر سامنے آنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ بیتی نگار کسی مجبوری کے باعث اپنی خامیوں، کمزوریوں اور سچائیوں کو بیان نہ کرے۔ اگر ایسا کیا جائے تو ایسی آپ بیتی فنی اعتبار سے ناقص ہو گی، کیوں کہ سچائی اور راست بازی آپ بیتی کی بنیادی شرط ہے۔

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ آپ بیتی لکھنے کو امر محال کہتے ہیں۔ کوئی آدمی اگر مکمل آپ بیتی لکھنے کا دعوی کرتا ہے تو وہ بہت بڑی بات کا اعلان کرتا ہے۔ جو اس کی قدرت سے باہر ہے۔ وہ اپنے مضمون "اردو میں آپ بیتی" میں لکھتے ہیں کہ:

> آپ بیتی یا خود نوشت سوانح عمری کی صنف دوسروں کی لکھی ہوئی سوانح عمری کے مقابلے میں خاصی نارسا اور ناقص چیز ہے۔ اس کے راستے میں دو رکاوٹیں ہوتی ہیں دوسروں کا خوف اور اپنے آپ سے محبت۔[11]

وہ مزید لکھتے ہیں:

> اگر بے لاگ سچائی سوانح عمری اور آپ بیتی کی شرط اوّل ہے تو یہ مقصد آپ بیتی اچھی طرح پورا نہیں کر سکتی۔[12]

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی آپ بیتی کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> اپنی زندگی کے احوال، وواقعات کا بیان آپ بیتی کہلاتا ہے۔ اسے خود نوشت بھی کہہ سکتے ہیں۔ آپ بیتی محض احوال و واقعات کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ اکثر اوقات لکھنے والے کی داخلی کیفیتوں، دلی احساس، شخصی اور عملی تجربوں، زندگی کے جذباتی پہلوؤں اور بحیثیت مجموعی زندگی کے بارے میں اس کے نقطہ نظر کی ترجمانی کرتی ہے۔ مصنف بعض اوقات ان خارجی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی عوامل کا ذکر کرتا ہے جو کبھی اس پر اثر انداز ہوئے یا جنھوں نے اس کی زندگی کا ایک خاص رخ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔[13]

آپ بیتی زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اور اس آئینے میں جھلکنے والی تصویر محض جامد و ساکن نہیں ہوتی بلکہ ریحانہ خانم کے مطابق رواں دواں اور جیتی جاگتی تصویر ہوتی ہے۔ ریحانہ خانم آپ بیتی کیا ہے میں رقم طراز ہیں:

> ایک فرد کی تصویر، اس کی پوری دنیا، دنیا میں گزرے ہوئے شب و روز میں پیش آنے والے ہر طرح کے کوائف، کوائف میں نفسیاتی الجھنیں اور کشمکش، سوچنے کے انداز، محسوس کرنے کے طریقے، جذباتی نظام کے محرکات، غرض ایک اچھی آپ بیتی میں سب کچھ نظر آتا ہے آپ بیتی اگرچہ خالص شخصی اور ذاتی تخلیق ہوتی ہے۔ اس میں مصنف اپنی ذات کا تجزیہ و محاسبہ کرتا ہے تاہم مصنف اپنی ذات کو اپنے عہد کے رویوں، رواجوں، عقائد اور معاشرت سے علیحدہ نہیں رکھ سکتا۔ یوں آپ بیتی نہ صرف شخصی بیانیہ بلکہ عصری بیانیہ بھی ہوتی ہے۔[14]

آپ بیتی شخصیت کی تاریخ کے ساتھ ساتھ شخصیت کے عہد کی تاریخ بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ دنیا میں واقعات کا سلسلہ اتنا مربوط ہوتا ہے کہ اپنی کہانی اسی صورت میں پوری ہو سکتی ہے جب دوسروں کے حالات بھی درج کیے

جائیں۔ عہد اور معاشرے سے ہٹ کر انسان اپنے وجود کو ثابت نہیں کر سکتا۔ اس طرح آپ بیتی داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔

اردو ادب میں آپ بیتی کی روایت:

علم الدین سالک کے مطابق "آپ بیتی اتنی ہی پرانی ہے جتنا خود انسان "یعنی اپنے اوپر بیتے حالات و واقعات کا تذکرہ کرنا انسان کی سرشت میں ہے۔"[۱۵]

آپ بیتی کی ابتدا کا واضح ثبوت ملنا دشوار ہے کیوں کہ آغاز میں آپ بیتی اور تاریخ میں فرق نہ کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے عہد میں آپ بیتی کی روایات ملتی ہیں۔ ابن خلدون نے آپ بیتی لکھی۔

آپ بیتی کو پہلے پہل باقاعدہ ایک صنف کے طور پر انگریزی ادب میں فروغ حاصل ہوا اور اس زبان میں بلند پایہ تصانیف موجود ہیں۔ ہندوستان میں جب انیسویں صدی میں انگریزی ادب سے اکتساب کا عمل شروع ہوا تو یہاں بھی مسلمانوں اور ہندوؤں نے انگریزی زبان میں بہت سی آپ بیتیاں لکھیں۔ فارسی اور ترکی زبان کے ذریعے ہندوستان میں پہلے یہ صنف متعارف ہو چکی تھی۔ فارسی زبان کو سرکاری سرپرستی کا درجہ حاصل تھا۔ یہاں تزوکات شاہی ایک ایسا انمول خزانہ ثابت ہوا جس نے اردو ادب پر اور خصوصاً "آپ بیتی" کی صنف پر ان مٹ نقوش چھوڑے۔ آپ بیتی کے موجودہ فنی تقاضوں کو مد نظر رکھیں تو آج ان تزوکات میں بہت سی کمزوریاں نظر آتی ہیں۔ خصوصاً "داخلیت کا پہلو دب کر رہ گیا ہے۔ خارجی واقعات کا بیان اس قدر زیادہ ہے کہ یہ آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی کے زمرے میں آتی ہیں۔ یہ اس عہد کا تقاضا تھا اور شاہی زندگی کی عمدہ مثال بھی، جب کہ آپ بیتی کی حقیقی صورت قدرے جدید دور کی پیداوار ہے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے واقعات نے ہماری سیاسی اور ادبی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ غم جب حد سے بڑھ جائے تو اظہار کی کوئی نہ کوئی صورت خود بخود نکل آتی ہے۔ ان حالات میں لوگوں نے شدت غم کم کرنے کے لیے ڈائریوں، روزنامچوں اور خطوط وغیرہ کا سہارا لیا۔ شروع میں جو آپ بیتیاں لکھی گئیں ان کا پس منظر بھی ۱۸۵۷ء کے حالات ہی قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

۱۹۴۷ء تک اردو آپ بیتی کا جو سرمایہ ہے اس پر نظر ڈالیں تو ان آپ بیتیوں میں ہیئت اور طریقہ کار کا بڑا اختلاف پایہ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص کو پیش آنے والے واقعات کی نوعیت الگ ہوتی ہے۔ ویسے بھی طبعاً ہر شخص دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ لہذا اختلاف رائے کی گنجائش نکل آتی ہے۔ ان آپ بیتی نگاروں میں ایک خاص کمی یہ بھی ہے کہ جب بھی کسی نے اپنی سرگزشت لکھنے کا آغاز کیا تو اس نے دوسروں سے استفادہ نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے

کہ فنی لحاظ سے بھی ہر کتاب مختلف نظر آتی ہے۔تاہم ایسی آپ بیتیوں کی تعداد حوصلہ افزا ہے جن کے بعض اجزا قابل قدر ہیں۔کوئی نہ کوئی ایسی خوبی ہر تصنیف میں موجود ہے جس کے اثرات دیر پا ثابت ہوئے ہیں۔بعض آپ بیتیوں میں احوال زندگی کی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔دیکھا جائے تو یہ اس صنف کی خاص کمزوری ہے۔زندگی کے تمام دنوں کا تعین کرنا ایک ناممکن بات ہے تاہم زندگی کے ایک بڑے حصے کا ذکر آپ بیتی میں ضرور موجود ہونا چاہئے۔مقالہ ہذا میں جن آپ بیتیوں کو جگہ دی گئی ہے۔ان کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔پہلی قسم جزوی آپ بیتیوں پر مبنی ہے۔ان میں کالا پانی از مولانا جعفر تھانیسری،میرا افسانہ افضل حق،قید فرنگ حسرت موہانی،خون بہا حکیم احمد شجاع کو شامل کیا جاسکتا ہے۔دیگر آپ بیتیاں کسی حد تک مکمل اور زندگی کے ایک بڑے حصے کی ترجمان ہیں۔ان میں داستان غدر از ظہیر دہلوی،آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ابوالکلام آزاد،آپ بیتی از خواجہ حسن نظامی،کارنامہ سروری نواب سرور جنگ،میری کہانی میری زبانی سید ہمایوں مرزا اور اعمال نامہ از سید رضا علی اور شہاب نامہ از قدرت اللہ شہاب شامل ہیں۔

کالا پانی (تواریخ عجیب) از مولانا محمد جعفر تھانیسری:

مولانا محمد جعفر ضلع انبالہ میں تھانیسر کے مقام پر رہتے تھے۔وہ اپنے شہر کے نمبردار بھی تھے۔ان کا تعلق وہابی تحریک سے رہا۔کسی نے انگریز سرکار سے مخبری کی کہ وہ مجاہدین کی مختلف صورتوں میں مدد کرتے ہیں۔اس سلسلے میں ان کے گھر کی تلاشی لی گئی جس کے نتیجے میں ایسے خطوط ملے جو جعفر تھانیسری کی مذہبی عقیدت اور ارادوں پر روشنی ڈالتے تھے۔اسی وجہ سے جعفر تھانیسری دیگر ساتھیوں سمیت گرفتار ہوئے۔سزا کے طور پر پہلے پھانسی تجویز کی گئی پھر یہ سزا کالا پانی میں تبدیل ہوگئی۔دسمبر ۱۸۶۳ء سے گرفتاریاں شروع ہوئیں۔کچھ عرصہ مقدمہ چلا پھر مولانا جعفر تھانیسری دیگر ساتھیوں سمیت کالا پانی کی سزا کے طور دریائے شور پار انڈمان پہنچے۔جہاں اٹھارہ سال کا عرصہ گزارنے کے بعد ۲۴ جنوری ۱۸۸۳ء کو رہائی ہوئی۔کالا پانی ان کی بیس سالہ زندگی کے واقعات کی روداد ہے۔جو ہندوستان کی سیاسی صورت حال کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں کی ثقافت کی بھی ترجمان ہے۔مصنف آغاز میں وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کالا پانی سے واپسی پر قریبی دوستوں اور رشتے داروں نے وہاں کے جزائر کی کیفیت پوچھنی شروع کی تو ہر شخص کے روبرو ان حالات کو بیان کرنا مشکل تھا اس لیے انھوں نے کچھ ضروری ضروری حالات و واقعات جو اس مدت میں ان کو پیش آئے ان کو مختصر طور پر لکھ لیا اور ہر سائل کے سامنے ان کو پیش کر دیتے۔پہلے پہل مولانا جعفر تھانیسری نے دوران قید اپریل ۱۸۷۹ء میں ایک کتاب تواریخ پورٹ بلیر،تاریخ عجائب لکھی تھی۔اسی کتاب کے دیباچہ میں قارئین سے التجا بھی کی گئی کہ وہ ان کی رہائی کی دعا کریں۔اس کتاب کو

بعد میں اپنے ملک کی زبان میں شائع کرنے کا وعدہ بھی تھا۔ چند سال بعد اس کتاب کو ۱۸۸۵ء میں، تاریخ عجائب کے عنوان سے شائع کیا۔ یہ چھوٹے سائز کے ۱۴۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ کالا پانی (تواریخ عجائب) چالیس مختصر ابواب پر مبنی ہے۔ واقعات کی مناسبت سے ہر باب کا عنوان تجویز کیا گیا ہے۔ یہ واقعات چوں کہ مصنف کی بیس سالہ زندگی پر محیط ہیں۔ اس حوالے سے یہ کتاب جزوی آپ بیتی کی ایک مثال قرار دی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر صبیحہ انور اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

> قید و زندان کے حالات پر مشتمل تصانیف اور بھی موجود ہیں۔ لیکن انڈمان کی دنیا ہماری دنیا سے اور ہمارے ماحول سے بالکل مختلف تھی۔ اپنی ذات کی جھلکیوں کے ساتھ وہاں کے حالات کی تصویر کھینچ کر جعفر تھانیسری نے اردو کے ذخیرے میں ایک اہم اضافہ کیا ہے۔[۱۵]

مولانا جعفر تھانیسری سے قبل اردو آپ بیتی کی روایت نہ ہونے کے برابر تھی۔ انھوں نے قید و بند کی داستان لکھ کر اردو آپ بیتی کے لیے ایک راستہ نکالا ہے۔ اگرچہ یہ راستہ نامکمل ہے مگر اصل منزل کی جانب ضرور لے جاتا ہے۔

میرا افسانہ از افضل حق:

میرا افسانہ میں افضل حق نے اپنی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات کو پیش کیا ہے۔ بچپن کے حالات، ملازمت سے سیاست کی جانب رغبت اور پھر قید و بند کی صعوبتیں ان سب کو ضروری تفاصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس ذیل میں مصنف کی ذہنی، نفسیاتی اور جذباتی کیفیات پر روشنی پڑتی ہے۔ مصنف کا نقطہ نظر کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ انگریزوں کے عتاب سے مسلمانوں کا جو حشر ہوا اس کی تصدیق اس آپ بیتی سے ہوتی ہے۔

بچپن ہر کسی کو عزیز ہوتا ہے لیکن میرا افسانہ میں بچپن تلخ یادوں پر مبنی ہے۔ مکتبی نظام میں بچوں پر ہونے والے تشدد کو بیان کیا گیا ہے اور اس ناقص طریقہ تعلیم پر تنقید کر کے اصلاح کا راستہ نکالا ہے۔

پولیس کی ملازمت کے دور کا ذکر کرتے ہوئے زیادہ تر اس پیشے کی خرابیوں کو پیش کیا ہے۔ دوران تفتیش پولیس کو کون سے ہتھکنڈے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ یہ رازداری کی باتیں افضل حق کی آپ بیتی میں کھلے عام بیان کی گئی ہیں۔ عوام میں جذبہ بیداری پیدا کرنے کی خاطر مختلف تحریکوں میں شمولیت اور اس کے باعث پیش آنے والے آلام و مصائب، وطن کی محبت کے بدلے قید و بند کی صعوبتیں، قیدیوں سے ناروا سلوک اور جیل سے متعلق مصنف کے مشاہدات اس آپ بیتی کے نمایاں پہلو ہیں۔

میرا افسانہ میں نصف سے زائد واقعات سیاسی قیدیوں کے حالات، سرگرمیوں اور مصیبتیں جھیلنے سے متعلق ہیں۔ "دوزخ کا نقشہ" عنوان کے تحت مصنف نے جیل کی اندرونی زندگی پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس آپ

بیتی میں مصنف نے دو طرح سے دلچسپی کا سماں باندھا ہے۔اول دلچسپ واقعات کا انتخاب کر کے، دوم عام واقعات کو دلچسپ پیرائے میں ادا کر کے،ان دونوں صورتوں میں مصنف کامیاب نظر آتا ہے۔تاہم آپ بیتی میں یہ انداز بعض اوقات حقیقت سے دور لے جاتا ہے اور اس سے مبالغے کے عنصر کے شامل ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔

میرا افسانہ کو آپ بیتی کا ایک حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔جس میں سیاسی اور تاریخی واقعات کے ساتھ شخصیت کے نقوش بھی ملتے ہیں۔اسے ادب میں وہی مقام حاصل ہے جو قید فرنگ کو حاصل ہے۔

قید فرنگ از حسرت موہانی:

سید فضل الحسن حسرت موہانی ادب کے علاوہ سیاست کے میدان میں بھی سر گرم عمل رہے۔"اردوئے معلی" ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے شعر و سخن کے پھول برسائے جاتے اور ساتھ ہی سیاسی تربیت کے لیے اسے استعمال بھی کیا جاتا۔دیگر اصحاب کے ادبی مضامین بھی اس میں شائع ہوتے تھے۔۱۹۰۸ء میں اس میں ایک گم نام صاحب کے قلم سے ایک مضمون نامور لیڈر مصطفی کمال کی موت پر شائع ہوا جس میں مصر میں انگریزوں کی پالیسی پر تنقید کی گئی تھی۔انگریز حکام کی نظر میں یہ مضمون قابل اعتراض تھا۔اس کی تمام تر ذمہ داری حسرت موہانی نے اپنے ذمے لے لی۔جس کی پاداش میں حسرت موہانی کو دو سال قید بامشقت کا حکم ملا. قید فرنگ اسی دور کی یادگار ہے۔

قید فرنگ موضوع کے اعتبار سے محدود ہے۔حسرت موہانی کے ساتھ جیل میں امتیازی سلوک روا رکھا گیا۔انگریز حکام جیل میں ان کو اذیتیں پہنچانے میں خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ان کو عام قیدیوں کے مقابلے میں بدتریں حالات کا سامنا کرنا پڑا۔حسرت موہانی نے بغیر تمہید باندھے یا مقدمہ کی تفصیل بتائے جیل کے حالات لکھنا شروع کر دیئے تھے۔اختصار اس کتاب کی خاص خوبی ہے۔انہوں نے حالات کو من و عن پیش کیا ہے۔کتاب کے شروع میں سید سلیمان ندوی کا مضمون حسرت کی سیاسی زندگی ماضی کے چند یادگار واقعات کا ترجمان ہے۔ان کے ابتدائی اور خاندانی حالات کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے۔

قید کا یہ دورانیہ جہاں بعض تلخ تجربات کا باعث بنا وہیں شعری ذوق کا ایک محرک بھی ثابت ہوا۔انہوں نے اس کلام کو کتاب کے آخر میں شامل کیا ہے۔اس طرح یہ آپ بیتی نہ صرف اس دور میں پیش آنے والی ذہنی و جسمانی سزا کی عکاس ہے بلکہ دلی جذبات کی بھی آئینہ دار ہے۔حسرت موہانی نے قید کا ایک سال سنٹرل جیل الہ آباد میں گزارا۔وہاں کے قوانین، قیدیوں کی نفسیات اور جیل میں قیدیوں کی درجہ بندی کے علاوہ جیل کے عملے کو خاص طور پر موضوع بنایا گیا ہے۔

قید فرنگ کی خاص خوبی زندانی معاشرت کی عکاسی ہے۔ مصنف نے اپنے حال سے زیادہ گردو پیش پر نظر رکھی ہے۔ قیدیوں کے روز وشب، جیل کے قوانین، عملے کا ناروا سلوک، انگریز حاکمین سے بے زاری اور اپنے دل کی ویرانی اور مجبوریوں کا خوب نقشہ کھینچا ہے قید فرنگ کے ذریعے اردو آپ بیتی میں کوئی خاطر خواہ اضافہ تو نہیں ہوا۔ تاہم اس کتاب کی اہمیت اس لحاظ سے کیا کم ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کے قلم سے لکھی گئی ہے جو ہماری سیاسی تاریخ کا اہم باب ہے۔

خون بہا از حکیم احمد شجاع:

خون بہا بھی مکمل آپ بیتی کی تعریف پر پوری نہیں اترتی اور مصنف کی زندگی کے کچھ اوراق ہی کو ہمارے سامنے رکھتی ہے۔ حکیم صاحب خود بھی کوئی مربوط آپ بیتی لکھنے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ ریحانہ خانم نے اس آپ بیتی کو تاثرات کا مجموعہ سے موسوم کیا ہے۔

خون بہا میں حکیم احمد شجاع اپنے عقائد، افکار اور نظم و نثر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ بزرگوں، استادوں اور رفیقوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ تصنیف کے مطالعے سے مصنف کا جو خاکہ قاری کے ذہن میں ابھرتا ہے وہ ایک پر خلوص اور محبت سے گندھے شخص کا خاکہ ہے۔

خون بہا میں ایک چیز کھٹکتی ہے کہ واقعات زندگی کو "پچھلے پچاس برس" عنوان کے تحت پیش کیا گیا ہے لیکن یہ واقعات اس مدت کا احاطہ نہیں کرتے اور اس کتاب کا دوسرا حصہ ۱۹۲۷ء کے ہنگامے کے دوران ضائع ہو گیا تھا۔ جہاں تک خون بہا کے اسلوب کا تعلق ہے حکیم احمد شجاع چونکہ فن ڈرامہ نگاری میں کمال رکھتے ہیں۔ انہوں نے بڑی مہارت سے واقعات کو پیش کیا ہے۔ حکیم احمد شجاع نے اپنی ذات کے آئینے میں دیگر بے شمار شخصیات سے بھی متعارف کرایا ہے۔

داستان غدر از ظہیر دھلوی:

داستان غدر ظہیر دھلوی کی آپ بیتی ہے۔ وہ آخری مغل تاج دار بہادر شاہ ظفر کے ہاں داروغہ کی حیثیت سے متعین تھے۔ غدر ۱۸۵۷ء نے نہ صرف دہلی بلکہ پورے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ خون ریزی کا ایک سیلاب تھا۔ دہلی میں مقیم ہر خاص و عام سب اس کی لپیٹ میں آئے۔ تاریخ غدر کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ظہیر دہلوی نے بھی اپنی خود نوشت کے آئینے میں قتل و غارت کی نایاب تصویریں دکھائی ہیں۔ مغل تاج دار اور ان کے اہل خانہ کی بے کسی و بے بسی کا جو نقشہ ظہیر نے پیش کیا ہے وہ دیگر تاریخی کتب میں نظر نہیں آتا۔

غدر دہلی اور سوانح حیات حضرت ظہیر دھلوی پر مبنی زیر نظر نسخہ پہلے پہل مطبع کربس لاہور سے شائع ہوا۔ ۲۵۷ صفحات پر مشتمل اس نسخے میں سال اشاعت اور سال تصنیف کا ذکر نہیں ملتا۔ ظہیر دہلوی کا سال وفات ۱۹۱۰ء ہے۔ واقعات کی نوعیت سے پتہ چلتا ہے کہ ظہیر نے اس کتاب کو وفات سے کچھ عرصہ قبل پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اس کتاب کا مسودہ حضرت ظہیر کے نواسے میر اشتیاق حسین دہلوی کے ہاں موجود تھا۔ کتاب کی موجودہ صورت حال اس کی قدامت کا بین ثبوت ہے۔ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے۔ داستان غدر محض انقلاب ۱۸۵۷ء تک محدود نہیں۔ چوں کہ اس واقعے کو آپ بیتی میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اسی مناسبت سے عنوان تجویز کیا گیا ہے۔ شاہی دربار اور لال قلعہ کی تباہی کے ساتھ ساتھ مصنف کے اوائل عمر سے آخری دنوں تک کے حالات پوری تفصیل کے ساتھ آ گئے ہیں۔ غیر ضروری واقعات کے بیان میں مصنف نے صرف نظر سے کام لیا ہے۔ داستان غدر کسی ایک فرد کی کہانی نہیں پورا سماج اس صف میں کھڑا نظر آتا ہے۔ آپ بیتی کے تقاضوں کے مطابق ظہیر شروع سے آخر تک نمایاں شریک ہیں۔

داستان غدر میں شروع کے ۱۴ صفحات خالصتاً مصنف کے ذاتی احوال کا مرقع ہیں۔ جس میں بچپن کے حوالے سے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ واقعات کو عنوان کی مناسبت سے پیش کیا گیا ہے۔

داستان غدر کی مجموعی حیثیت پر نظر ڈالیں تو ظہیر نے تہذیب و معاشرت اور ماحول کی عکاسی میں جس کمال درجہ سے کام لیا ہے۔ اس کی داد دینا پڑتی ہے۔ مغل حکمرانی کے مٹتے ہوئے نقوش، دہلی شہر کی تقریبات، غدر کے باعث تباہی و بربادی، لال قلعہ کے خانگی حالات، ملازمین شاہی کی حالت، جے پور کے راجاؤں کی صورت حال اور وہاں کے عجائبات، اس دور کی مجلسی زندگی، حیدر آباد میں لوگوں کا معیار زندگی ان سب کے بیان میں مصنف نے جزئیات سے کام لیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے تنقیدی مضمون "ظہیر دہلوی کی خودنوشت" میں رقم طراز ہیں۔

> آپ بیتی لکھنے کے لیے جس قلم اور جیسے دل و دماغ کی ضرورت ہوتی ہے وہ قدرت کی طرف سے ظہیر کو حاصل تھا۔[۱۱]

جہاں تک غدر کے واقعات کا تعلق ہے اس کتاب میں وہی واقعات بیان کیے گئے ہیں جو مصنف کی زندگی سے مربوط ہیں۔ اس حوالے سے داستان غدر موضوع کے اعتبار سے ایک جامع کتاب نہیں ہے۔ اس کی وجہ تصنیف غدر قرار دیا جا سکتا ہے۔ ظہیر کی یہ تصنیف تاریخ ہندو پاک کا ایک نمایاں باب ہے۔

تذکرہ از ابوالکلام آزاد:

مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار ان اہل قلم میں ہوتا ہے، جنہوں نے چھوٹی عمر میں بڑے بڑے علمی و ادبی کارنامے سر انجام دیئے ہیں۔ آزاد کا ذوق علم و ادب تک محدود نہ تھا بلکہ مذہب اور سیاست بھی ان کے محبوب موضوعات

تھے۔ ۲۴ سال کی عمر میں ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو "الہلال" کا پہلا شمارہ نکالا۔ اس رسالے پر پابندی عائد ہونے کے باعث انہوں نے ایک دوسرا پرچہ "البلاغ" جاری کیا۔ جدت خیالات کی خوبی کے باعث انہوں نے ادب میں اپنا الگ مقام پیدا کیا۔

تذکرہ ابوالکلام آزاد کی نظر بندی کے دنوں کی یاد ہے۔ فضل الدین مرزا کے پر زور اصرار پر وہ اپنی سرگزشت لکھنے پر راضی ہوئے۔ مسودہ ضخیم ہونے کی وجہ سے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلا حصہ تذکرہ ہے۔ دوسرا حصہ تاحال شائع نہیں ہوا۔ تذکرہ میں مولانا آزاد اپنے پر دادا شاہ محمد افضل کے مادری سلسلے کے بزرگ حضرت شیخ جمال الدین کے حالات پر مشتمل ہے۔ دوسرا باب شیخ جمال الدین کے بیٹے شیخ محمد کے حالات پر مبنی ہے۔ تیسرے باب میں ان کے پر دادا شاہ محمد افضل اور ان کے والد خیر الدین کے نانا منور الدین کے حالات زندگی پیش کئے گئے ہیں۔ یہ تینوں باب مولانا آزاد نے جون ۱۹۱۶ء سے ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۶ء تک رقم کئے۔

تذکرہ کو آپ بیتی کی روایت میں خاص مقام حاصل نہیں یہ مولانا کی داخلی زندگی سے زیادہ فنی کمالات کا اظہار ہے۔ شخصیت کے چند نقوش شاعرانہ انداز بیان میں لپٹے نظر آتے ہیں۔ مولانا کی زندگی کی حقیقی تصویر ان کی دوسری تصنیف آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی کو ملا کر ہی واضح ہوتی ہے۔ تاہم تذکرہ تاریخی اعتبار سے خاصے کی چیز ہے۔ تذکرہ نگاری میں ابوالکلام آزاد کو اس تصنیف کے باعث قابل قدر مقام حاصل ہے۔

آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی از ابوالکلام آزاد:۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے "الہلال" اور "البلاغ" کے بعد "پیغام" جاری کیا۔ اس رسالے میں ان کی معاونت عبدالرزاق ملیح آبادی نے کی۔ عبدالرزاق ملیح آبادی مولانا کے ہمراہ ۱۹۲۱ء میں جیل گئے تو انہوں نے ابوالکلام آزاد کو تذکرہ کی دوسری جلد لکھنے پر اکسایا۔

بہت اصرار کے بعد انہوں نے اپنی کہانی سنانا شروع کی تھی۔ وہ بولتے جاتے تھے اور عبدالرزاق ملیح آبادی پنسل سے یہ واقعات لکھتے جاتے تھے۔ اس طرح آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی عبدالرزاق ملیح آبادی کی روایت سے سامنے آئی۔ یہ نسخہ مکتبہ خلیل اردو بازار لاہور نے شائع کیا گیا ہے۔ سال اشاعت درج نہیں۔ کتاب کا کاغذ اور طباعت زیادہ پرانی نہیں۔ یہ کتاب ۳۴۴ صفحات پر مبنی ہے۔ آخری ۱۹۲ صفحات مصنف کی ذاتی زندگی سے متعلق ہیں۔ مولانا آزاد نے اپنے بارے جو معلومات پیش کی ہیں تذکرہ میں پیش کی جانے والی معلومات سے کہیں زیادہ ہیں۔ ابوالکلام کی شخصیت کے بیشتر پہلو اس میں سمٹے ہوئے ہیں۔ مولانا نے اپنے احوال کا بیان بسم اللہ کی رسم سے شروع کیا ہے۔ تعلیم و تربیت کے علاوہ بچپن کے مشاغل اور دلچسپی سے بھی دوسروں کو آگاہ کیا ہے۔ آخر تک تمام

واقعات کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ واقعات سے مربوط عنوان تجویز کئے گئے ہیں۔ مولانا پس منظر میں جائے بغیر کوئی واقعہ بیان نہیں کرتے ہیں یہی خصوصیت پوری کتاب میں نظر آتی ہے۔

ابوالکلام کی طبیعت کا خاص رنگ اس آپ بیتی سے جھلکتا ہے۔ ان کے ہاں افکار و عقائد میں ایک انقلاب نظر آتا ہے۔ انہوں نے رسمی قیود سے آزادی حاصل کی۔ جوں جوں تعلیمی شعور بڑھا انہوں نے روایتی قدامت اور تقلید سے اجتناب کیا۔ تفتیش اور جستجو کے شوق نے مولانا کو نئے راستوں پر چلایا۔ ابوالکلام کے اسلوب کی خاص خوبی ان کی شاعرانہ نثر ہے۔ نثر میں وہ فارسی، عربی اور اردو اشعار کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ تذکرہ اور غبار خاطر میں انہوں نے خود نوشت حالات کو بیان کرنے کا جو انداز اپنایا ہے وہ اس کتاب میں مفقود ہے۔ ان کے اسلوب کی عمومی خصوصیات یہاں نظر نہیں آتیں۔ لہذا عبدالرزاق ملیح آبادی کا یہ دعویٰ انہوں نے ابوالکلام کے زبانی حالات ہو بہو پیش کیے ہیں، درست ثابت نہیں ہوتا۔ اس کتاب میں مولانا ابوالکلام کی زندگی کے تمام واقعات پیش نہیں کیے گئے تاہم آپ بیتی کے دائرہ کار کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے مکمل آپ بیتی قرار دیا جاسکتا ہے۔

آپ بیتی از خواجہ حسن نظامی:

خواجہ حسن نظامی اصلاً ایک پیر تھے۔ یہ کتاب لکھتے ہوئے انہوں نے خاص طور پر اپنے مریدوں کی اصلاح کو پیش نظر رکھا یہی وجہ ہے کہ ہر واقعہ کے بیان کے بعد شعوری طور پر اس میں اسباق اخذ کر کے دکھاتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے ذاتی محنت سے ترقی کی، ان کی زندگی کے بے شمار تجربات ہر صفحے پر بکھرے پڑے ہیں، تاہم واقعات اور حالات کا بیان مربوط نہیں ہے۔

ان عیوب کے باوجود ذاتی حالات اور نجی باتیں بہت جرات اور بے باکی سے بیان کیں ہیں۔ آپ بیتی میں حسن نظامی نے روسو کے اعترافات کا سا رنگ اختیار کیا ہے۔ اسی وجہ سے آپ بیتی لکھنے والوں میں حسن نظامی کا مرتبہ خاصا بلند ہے۔

میری کہانی میری زبانی از سید ہمایوں مرزا:۔

میری کہانی میری زبانی آپ بیتی کی روایت میں بلند پایہ حیثیت کی حامل ہے کیونکہ مصنف کے ذہن میں آپ بیتی کا واضح تصور اور خاکہ موجود تھا اور یہ ان کی شعوری کاوش سے تصنیف ہوئی۔ میری کہانی میری زبانی میں مصنف نے بچپن سے لے کر وفات سے کچھ عرصہ بیشتر تک کے حالات درج کر کے مکمل آپ بیتی کا نمونہ پیش کیا ہے۔ زندگی بھر کے حالات کے ساتھ ساتھ، ذہنی کیفیات، جذباتی احساسات اور نفسیاتی تاثرات بھی درج کئے گئے ہیں۔ اس داستانِ حیات کے مطالعے سے مصنف کے تجربے اور وسعت علمی سے واقفیت ہوتی

ہے۔ واقعات کا بیان تفصیل سے ہے تاہم معلومات اور دیگر ضمنی باتوں پر طوالتِ بحث سے ہمایوں صاحب آپ بیتی کی ڈگر سے ہٹ کر جگ بیتی کی روش پر چلنے لگتے ہیں۔

اعمال نامہ از سر سید رضا علی:

سر سید رضا علی کا تعلق سیاست سے رہا ہے اور آپ بیتی میں بھی انھوں نے حالات زندگی فراہم کرنے کے ساتھ معاشرت و سیاست کے مرقعے پیش کیے ہیں۔ تاہم سیاست نامہ حاوی رہا ہے۔ سر سید نے اپنی زندگی کے بہت سے نقوش ہم تک ضرور پہنچائے ہیں مگر کہیں ٹال مٹول سے بھی کام لیا ہے۔ بالخصوص نجی زندگی کا بیان بہت مختصر ہے۔ اعمال نامہ کے دیباچے میں سب کچھ بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن اس میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اس تصنیف میں وہ نقوش گہرے ہیں جو مدہم ہوتے یا معدوم تو کوئی فرق نہ پڑتا مگر وہ تصاویر دھندلی ہو گئیں ہیں جن کا چمکنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ کبھی تسلسل اور ترتیب میں بھی فرق آتا ہے۔ تاہم اعمال نامہ کو اردو آپ بیتی کی شعوری اور واضح کوشش کہہ سکتے ہیں۔

شہاب نامہ از قدرت اللہ شہاب:

قدرت اللہ شہاب کے ادبی سفر میں "یا خدا"، "ماں جی" کے ساتھ ساتھ "شہاب نامہ" وہ اہم تصنیف ہے، جس نے انھیں اردو ادب میں ایک نمایاں حیثیت دی ہے۔ "شہاب نامہ" میں ۵۹ عنوانات ہیں۔ جنہیں ابواب تصور کیا جا سکتا ہے۔ ان عنوانات کے تحت شامل لوازمے میں موضوعات، واقعات، مشاہدات اور شخصیات کا تذکرہ ایک اندرونی تسلسل کے ساتھ آکر عمدہ تصنیف کی صورت میں ڈھل گیا ہے۔ زمانی تسلسل اور سیاق و سباق کے ربط نے ایک ناول کی سی دلچسپی اور تجسس پیدا کر دیا ہے۔ آپ بیتی کے ذریعے قدرت اللہ شہاب کو ایک بہترین افسانہ نگار، کردار نگار اور خوب صورت ادبی نثر کے خالق کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا، محسوس کیا اور زندگی میں جو اتار چڑھاؤ آئے انھیں بلا کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ انھوں نے اپنی خامیوں کا تذکرہ، غلطیوں کا بیان کھل کر کیا ہے۔ ان کی آپ بیتی کی خاص خوبی انکشاف ذات ہے۔ "شہاب نامہ" میں جس صداقت اور دیانت داری سے قدرت اللہ شہاب نے اپنی زندگی کی تلخ سچائیوں، بچپن کے عشق اور اپنی شخصیت کے ناقابل یقین پہلوؤں کو بیان کیا ہے وہ بہت کم آپ بیتیوں میں نظر آتا ہے۔ شہاب نامہ اپنی چند ایک خامیوں کے علاوہ اردو آپ بیتیوں کے سفر میں اہم اور رجحان ساز آپ بیتی ہے۔

خواتین کی آپ بیتیوں میں ادراک ذات کا جائزہ:

زندگی کے ہر میدان کی طرح ادب میں بھی خواتین مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو وہ مردوں کے شانہ بشانہ نظر آتی ہیں۔ داستان، ڈرامہ، ناول، افسانہ، سفر نامہ، آپ بیتی اور شاعری ہر صنف میں خواتین نے اپنے قلم سے ایسی ایسی شاہکار تخلیقات ادب کو ورثہ میں دی ہیں کہ کہیں کہیں وہ مردوں سے بھی آگے نظر آتی ہیں۔ عورت کا مشاہدہ مرد کی نسبت سے زیادہ گہرا ہے اور فطری طور پر بھی وہ حساس واقع ہوئی ہیں۔ یہ حساسیت اس کی تحریروں میں بھی نظر آتی ہے۔ خواتین نے اپنی تخلیقات و نگارشات کو دنیا کے سامنے لا کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان کے افکار و خیالات، جذبات و احساسات کو بیڑیاں نہیں پہنائی جا سکتی ہیں۔ عورت صدیوں تک ذہنی و جسمانی قید کی سزا کاٹتی رہی ہے۔ لیکن جب حوا کی بیٹی کو قلم و قرطاس کا سہارا ملا تو اس نے اپنی آزادی و خود مختاری کے پروانے پر اپنا فرمان صادر کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔

اردو میں خواتین کی خود نوشتیں آغاز میں بہت کم تھیں۔ ۱۸۸۵ء میں شہر بانو بیگم دختر نواب اکبر علی خان (رئیس پاٹودی) نے اپنی آپ بیتی بیتی کہانی لکھی لیکن ڈیڑھ سال بعد ۱۸۸۷ء میں اس میں دیباچہ شامل کر کے اسے کتابی شکل دی۔ اس آپ بیتی کی اہمیت اردو کی اولین خود نوشت کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ اس دور میں ایک عورت کا ایک غیر معروف صنف ادب کو اپنانا ایک حیرت انگیز بات تھی۔ ۱۹۲۱ء میں عطیہ فیضی نے زمانہء تحصیل کے عنوان سے یورپ میں حصول علم کے لیے گزارے دنوں کی روداد لکھی۔ اس کے بعد قراۃ العین کا سوانحی ناول کار جہاں دراز ہے ۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۹ء (جلد دوم) میں منظر عام پر آیا۔ بیسویں صدی کے آخری عشرے سے اردو میں خواتین کی آپ بیتیوں کو زیادہ فروغ حاصل ہوا اور بری عورت کی کتھا (کشور ناہید، ۱۹۹۴ء)، جو رہی سو بے خبری رہی (ادا جعفری، جولائی ۱۹۹۵ء)، ہم سفر (حمیدہ اختر حسین، ۱۹۹۵ء)، کاغذی ہے پیرہن (عصمت چغتائی)، آئینے کے سامنے، (عطیہ داؤد۔ ۲۰۰۹ء)، رسیدی ٹکٹ (امرتا پریتم) تحریریں اپنے لکھنے والوں کا عکس ہوتی ہیں۔ خواتین کی تحریروں کے ذریعہ ان کی شخصیت، نظریات اور ان کی زندگی کے لائحہ عمل سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ آپ بیتی کی صنف میں خواتین نے بھی اپنے تہذیبی، سماجی، سیاسی، ادبی اور ثقافتی منظر ناموں کی ترجمانی و عکاسی کی ہے۔

بیتی کہانی از شہر بانو بیگم:

شہر بانو بیگم ریاست پاٹودی میں پیدا ہوئیں۔ شہر بانو نے خود نوشت میں اپنے حالات زندگی، رسم و رواج، تہذیب و معاشرت اور ۱۸۵۷ء کے حالات، خاندانی لقب "شیخان" کی وجہ تسمیہ، پاٹودی خاندان کی تاریخ وغیرہ کا

تذکرہ کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ابتداء ہوتے ہی شہر بانو کی زندگی بھی آلام و مصائب سے دوچار ہو گئی۔ شہر بانو بیگم نے اپنی خود نوشت بیتی کہانی کو ۱۸۵۷ء میں لکھا اور جنوری ۱۸۸۷ء کو اپنے دیباچے کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کرایا۔ اردو میں بیتی کہانی پہلی خاتون کی لکھی ہوئی خود نوشت ہے۔ اولیت کی بنیاد پر اس کی عظمت مسلم ہے۔

بیتی کہانی کو شہر بانو نے تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں شہر بانو نے اپنی پیدائش، منگنی، شادی، رخصتی اور محل کی خواتین کے رہن سہن کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے باب میں غدر کے حالات اور اپنے گھر پاٹودی کا لوٹا جانا، رئیس جھجھر کی گرفتاری و پھانسی، جھجھر ریاست کا ضبط ہو جانا، اور ان کے اہل و عیال کا جلا وطن ہو کر لدھیانہ منتقل ہو جانا وغیرہ کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں شہر بانو بیگم نے اپنے خاندان کی مختصر تاریخ، خاندان کا لقب "شیخان" کی وجہ تسمیہ تصوف کی کتابوں کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ خاندان کے مورث اعلیٰ اور ان کی اولادوں کے عادات واطوار وغیرہ کی تفصیلات بیان کی ہیں۔

کاغذی ہے پیرہن از عصمت چغتائی:

عصمت کی پیدائش ۲۱ اگست ۱۹۱۵ء کو بدایون اور پرورش جودھ پور میں ہوئی۔ عصمت چغتائی ایسی فنکار ہیں جنہوں نے سماجی جبر واستحصال کو محسوس کیا اور اپنی تخلیقات میں پیش کیا۔ عصمت نے متوسط طبقہ کے ماحول اور طرز زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور پرکھا۔ مشرقی خواتین کی بے بسی، لاچاری اور محرومی سے انہیں گھن آتی تھی۔ عصمت نے خواتین پر ہونے والے ذہنی، جسمانی، جنسی، اور سماجی جبر و مظالم کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ عصمت نے کاغذی ہے پیرہن کے نام سے اپنی خود نوشت لکھنے کی کوشش کی ہے۔ کاغذی ہے پیرہن عصمت کی یادوں اور خاندان کی سنی سنائی باتوں کا ایک مجموعہ ہے۔ عصمت نے اپنی زندگی کے حالات کو مختصر طور پر بیان کیا ہے۔ عصمت کی حساس طبیعت نے چیزوں کو بڑی گہرائی سے دیکھنے اور سمجھنے کا عادی بنا دیا تھا۔ اپنی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو عصمت نے بڑی دلچسپی سے بیان کیا ہے۔ عصمت اپنی بچپن کی یادوں کو حسین و شیریں یادوں سے تعبیر نہیں کرتیں۔ بلکہ اسے محرومیوں اور مجبوریوں سے تعبیر کرتی ہیں۔ جہاں انہیں مرد ذات کے تخلیق کردہ دستور حیات اور رسم ورواج سے گھٹن تھی، وہیں دوسری طرف خواتین کی ہوشیاریوں، مکاریوں، چاپلوسیوں سے بھی ان کو کڑھن ہوتی تھی۔ بقول عصمت کے وہ یہ نسائی گر کبھی نہیں سیکھ پائیں۔ عصمت کی یہ خود نوشت فن کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی پھر بھی اس کی ادبی و ثقافتی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ یہ خود نوشت عصمت کی تفہیم میں کلیدی اہمیت رکھتی ہے۔

رسیدی ٹکٹ از امرتا پریتم:

امرتا پریتم کی پیدائش گوجرانوالا پنجاب پاکستان میں اور پرورش لاہور میں ہوئی۔ امرتا پریتم کی خود نوشت رسیدی ٹکٹ ہندی زبان میں ہے۔ ان کی یہ خود نوشت ۴۳ عنوانات پر مشتمل ہے۔ امرتا نے اپنی زندگی کے اہم واقعات کو من و عن پیش کیا ہے۔ اپنی زندگی کے اہم واقعات کو تشبیہات واستعارات اور علامتوں کے پردے میں پیش کیا ہے۔ خاتون خانہ ہونے کے باوجود امرتا نے اپنے اور ساحر کے عشق کی داستان کو بڑی بے باکی سے پیش کیا ہے۔ ان کی خود نوشت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ امرتا نے مادی دنیا کے ساتھ ساتھ ایک روحانی دنیا بھی بسا رکھی تھی جس میں صرف ساحر اور امرتا کا گزر تھا۔ امرتا نے اپنی خود نوشت لکھتے وقت بیتے لمحوں کی یاد کو قیامت کا دن قرار دیا ہے جب انسان کا ہر عمل اس کے سامنے لا کر رکھ دیا جائے گا۔ اپنی خود نوشت کے موضوعات کے مطابق انہوں نے عنوانات دیئے ہیں۔ اپنی والدہ کی وفات کو زندگی کا ایک بڑا سانحہ قرار دیتی ہیں۔ اپنے جذبات واحساسات کو شاعری میں ڈھالتی ہیں مگر اپنے والد کے ڈر سے پھاڑ دیتی ہیں۔ اپنی خود نوشت میں محبت کی ناکامی اور اس کی وجہ سے وہ جس ذہنی اذیت کا شکار رہیں اس کا اظہار بھی شامل ہے۔ امرتا عورت کی ذات وصفات کی وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ ہر عورت کے دماغ میں یہ بات ڈال دی جاتی ہے کہ مرد کے سہارے کے بغیر عورت ادھوری ہے۔ عورت کو عدم تحفظ وراثت میں ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی خود نوشت میں اپنی زندگی کے ہر لمحے اور لمحات سے جڑے اچھے برے تمام کرداروں کو شامل کیا ہے۔

جنت سے نکالی ہوئی حوا از نفیس بانو شمع:

نفیس بانو کی زندگی غم والم اور جہد پیہم سے عبارت ہے۔ نفیس کی خود نوشت جنت سے نکالی ہوئی حوا ادب میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ نفیس بانو نے اپنی خود نوشت کو پچاس ذیلی ابواب کے تحت لکھا ہے۔ خود نوشت کا اسلوب سادہ، انداز بیان پر اثر، تحریر صاف، شستہ اور دلنشیں ہے۔ نفیس کی آپ بیتی پوری دنیا کی عورت ذات کی آپ بیتی ہے۔ انھوں نے سماج میں بے آبرو ہوئیں عورتوں کا ذکر بڑے پر درد الفاظ میں کیا ہے۔ نفیس کو داخلی کیفیت اور نسائی نفسیات کے بیان پر قدرت حاصل ہے۔ اپنی خود نوشت میں واقعات کی صداقت کے بیان میں انھوں نے مشرقی روایات کا گلا نہیں گھونٹا۔ خود نوشت میں متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی عکاسی کی ہے۔ ان طبقات کی کمزوریوں، محرومیوں، ناکامیوں اور ان سے پیدا ہونے والی نفسیات کو اپنی ذات کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ پوری خود نوشت پر یاس وحرماں کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ کم عمری میں اپنوں سے بچھڑنے کا دکھ اور پھر ازدواجی زندگی کی ناخوشگواریوں نے انہیں اپنی جان لینے پر مجبور کر دیا مگر موت نے بھی ان کو گلے لگانے سے انکار کر دیا۔ پھر نفیس نے اپنے مرشد سے

روحانی وابستگی قائم کرلیاور زندگی کے دیئے ہوئے ہر دکھ کو مسکراتے ہوئے برداشت کرنے کا گر سیکھ لیا۔

نوائے زندگی از ساجدہ زیدی:

دنیائے ادب کی معروف و ممتاز ادیبہ ،شاعرہ، ڈراما نگار، نقاد و دانشور پروفیسر ساجدہ زیدی ۱۸ مئی ۱۹۲۶ء میں میرٹھ کے ایک اعلیٰ، مہذب، روشن خیال خاندان میں پیدا ہوئیں۔ ساجدہ ایک حساس، روشن خیال اور ذہین خاتون تھیں۔ امور خانہ داری کے ساتھ ساتھ وہ پروفیشنل زندگی اور تخلیقی و تصنیفی سرگرمیوں میں بھی فعال رہیں۔ انھوں نے اردو اور انگریزی میں اپنی بیش بہا تصنیفات چھوڑی ہیں۔

نوائے زندگی کے مطالعہ سے ساجدہ زیدی کی شخصیت اور ان کی علمی و تخلیقی صلاحیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس خودنوشت کو دو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ انہوں نے زندگی اور خاندان کے واقعات کے ساتھ ایک دور کی پوری تاریخ پیش کر دی ہے۔ انہوں نے سماج و معاشرہ کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا اور اپنی تخلیق کا موضوع بنایا ہے۔ یہ خودنوشت سماجی، تہذیبی، سیاسی، تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس میں بچوں کی تعلیم و تربیت وغیرہ سے متعلق اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ماہر تعلیم ہونے کی وجہ سے انھوں نے تعلیمی نصاب کی کمیوں اور خامیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ وہ اشتراکی نظریہ کی حامی تھیں۔ اس لیے ان کی تحریروں میں مظلوموں، غریبوں، مزدوروں کی حمایت کی اور آزادی کے بعد مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے سیاسی، ثقافتی، لسانی، اقتصادی استحصال کا بھی تذکرہ بھی کیا۔

شورش دوراں از حمیدہ سالم:

حمیدہ سالم زمیں دار گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ حمیدہ سالم کا تعلق براہ راست ادب سے نہیں تھا۔ حمیدہ کی آپ بیتی شورش دوراں کسی ادیبہ و فنکارہ کی آپ بیتی نہیں ہے بلکہ ایک عام گھریلو اور درس و تدریس سے وابستہ خاتون کی آپ بیتی ہے۔ اس کے مطالعے سے ایک عام عورت کی سوچ و نفسیات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے بہن بھائیوں کی زندگی کے اہم گوشوں کو بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس دور کے معاشرتی، ثقافتی، سیاسی، اقتصادی، ادبی اور لسانی منظر نامے کو بھی پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی یہ آپ بیتی جاگیر دارانہ نظام اور ملک کی سیاسی، سماجی اقدار و روایات کے عروج و زوال کے بیان کے اعتبار سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ انھوں نے آپ بیتی کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

جو رہی سو بے خبری رہی از ادا جعفری:

جدید شعر و ادب کے معماروں میں ادا جعفری اک امتیازی مقام رکھتی ہیں۔ ان کو اردو شاعری کی خاتوں

اول کہاجاتاہے کیونکہ ان کی شاعری نے بیسوی صدی کی وسطی دہائیوں میں بہ اعتبار رہنمائی اور اثر پذیری اردو خاتون شعراء کے حق میں وہی کردار ادا کیا جو اٹھارہویں صدی میں ولی دکنی نے عام شعراء کے حق میں ادا کیا تھا۔ انھوں نے اپنے بعد آنے والی شاعرات کشور ناہید، پروین شاکر اور فہمیدہ ریاض وغیرہ کے لیے شاعری کا وہ راستہ ہموار کیا جس پر چل کر ان لوگوں نے اردو میں خواتین کی شاعری کو عالمی معیارات تک پہنچایا۔

ادا جعفری کا اصل نام عزیز جہاں تھا، شادی کے بعد انھوں نے ادا جعفری کے نام سے لکھنا شروع کیا۔ وہ ۲۲ اگست ۱۹۲۴ء میں بدایوں کے اک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ جب ان کی عمر تین برس تھی ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کا بچپن ننھیال میں گزرا۔ والد کی شفقت سے محرومی کا ان کے دل میں گہرا اثر ہوا۔ ان کی تعلیم گھر پر کرائی گئی۔ انھوں نے اردو، فارسی اور انگریزی میں مہارت حاصل کی۔ باقاعدہ کالج میں جا کر تعلیم حاصل نہ کر پانے کا ان کو ہمیشہ ملال رہا۔ ان کو بچپن ہی سے کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ نو سال کی عمر میں انھوں نے اپنا پہلا شعر کہا اور ڈرتے ڈرتے ماں کو سنایا تو انھوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ ان کی ابتدائی غزلیں ۱۹۴۰ء کے آس پاس اختر شیرانی کے رسالہ "رومان" کے علاوہ اس وقت کے معیاری ادبی رسالوں "شاہکار" اور "ادب لطیف" وغیرہ میں شائع ہونے لگیں اور ادبی دنیا ان کے نام سے متعارف ہو گئی۔ اس وقت بھی ان کی شاعری میں عام نسائی شاعری سے انحراف موجود تھا۔ ان سے پہلے کی شاعرات نے فکری یا ہئیتی اجتہاد کا حوصلہ نہیں دکھایا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں اردو ادب میں شروع ہونے والی نئی تحریک نے نئے سماجی رشتوں کا احساس اور نیا تاریخی شعور پیدا کیا تو ادا جعفری بھی اس سے متاثر ہوئیں لیکن انھوں نے فرسودگی اور قدامت کی بے جا بندشوں سے خود کو آزاد کر لیا۔ ۱۹۴۷ء میں ان کی شادی برٹش انڈیا کے ایک اعلیٰ افسر نور الحسن جعفری سے ہو گئی۔ ملک کے بٹوارے کے بعد وہ پاکستان آ گئے ۱۹۴۸ء میں ادا جعفری بھی پاکستان آ گئیں۔ جن علاقوں میں پاکستان بنا ان میں سماجی بندشیں ہندوستانی علاقوں کی نسبت سخت تھیں اور وہاں پر قابل ذکر خاتون ادیبوں کے ابھرنے کے امکانات نہیں تھے۔ ادا جعفری کی پاکستان میں اچھی آؤ بھگت ہوئی۔

ادا جعفری کا پہلا مجموعہ کلام ۱۹۵۰ء میں منظر عام پر آیا اور ان کی خوب پذیرائی ہوئی۔ اس کے بعد ان کے کئی مجموعے شائع ہوئے اور ادا جعفری نے شاعرات میں اپنی ممتاز جگہ بنالی۔ انھوں نے جاپانی صنف سخن ہائیکو میں بھی طبع آزمائی کی اور افسانے بھی لکھے۔ انھوں نے اپنی سوانح حیات جو رہی سو بے خبری رہی کے عنوان سے شائع کرائی۔ اس کے علاوہ انھوں نے قدیم اردو شعراء کے حالات بھی قلم بند کیے۔ ادا جعفری نے بھرپور مطمئن زندگی گزاری۔ شوہر کے ساتھ مختلف ملکوں کی سیر کی اور ان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالت کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ ادا جفری محض ایک جدید یا نسوانی لہجہ کی شاعرہ نہیں ہیں۔ وہ اپنے تخلیقی عمل میں اپنے ماحول اور گرد و پیش سے غافل نہیں رہیں۔ ان کی نظمیں ان کے سیاسی اور معاشرتی شعور کی عکاس ہیں۔ ان نظموں میں درد مندی اور حب الوطنی نمایاں ہے۔ جبکہ

غزلوں میں تازگی، شعور کی پختگی اور فن پر مضبوط گرفت نمایاں ہے۔ وہ ذاتی اور نجی مسائل کو مجموعی انسانی مسائل کے اک پرتو کے طور پر دیکھتی ہیں۔ ان کی شاعری شخصی سے زیادہ سماجی ہے۔ ان کی آواز میں بہر حال، رنج والم، خواب و حقیقت اور نشاط و مسرت کی اک اپنی دنیا بھی ہے وہ ہر پیرایہ ءاظہار میں سرتاسر شاعرہ رہی ہیں۔ زندگی کے اثبات کا احساس اور خوابوں کو حقائق کے آئینہ میں سنوارنے کا طور ادا جعفری کا طور ہے۔ ان کا فن اردو شاعری کی تاریخ کا اک درخشاں باب ہے۔

تصانیف:

ان کا باقاعدہ شعری سفر ۱۹۳۷ء سے ۲۰۱۵ء تک جاری رہا ان کی تصانیف یہ ہیں۔

۱۔ **غزالاں تم تو واقف ہو ۱۹۴۷ء**

۲۔ **میں سازڈھونڈتی رہی ۱۹۵۰ء**

۳۔ **شہر درد ۱۹۶۷ء**

۴۔ **ساز سخن بہانہ ہے(ہائیکو)۱۹۸۲ء**

۵۔ **حرف شناسائی**

۶۔ **جو رہی سو بے خبری رہی(خودنوشت)۱۹۹۵ء**

۷۔ **موسم موسم(کلیات)۲۰۰۲ء**

ان کی کلیات "موسم موسم" جس میں ان کے پانچ شعری مجموعے اور غیر مطبوعہ کلام پر مشتمل حصہ بہ عنوان "سفر باقی ہے" شامل ہے۔ ان کے شعری مجموعے شہر درد کو ۱۹۶۸ء میں آدم جی ادبی انعام ملا۔ ۱۹۹۱ء میں حکومت پاکستان نے ادبی خدمات کے اعتراف میں تمغہ امتیاز سے نوازا۔ ۱۲ مارچ ۲۰۱۵ء کو مختصر علالت کے بعد ۹۰ برس کی عمر میں ادا جعفری کا کراچی پاکستان میں انتقال ہو گیا۔

بری عورت کی کتھا از کشور ناہید:

کشور ناہید اس عہد کی رجحان ساز شاعرہ، نامور سوانح نگار، مشہور مترجم، مقبول کالم نگار اور پاکستان کی بیداری خواتین کی تحریک کے حوالے سے عالمی سطح پر متعارف کار کے طور پر عزت واحترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں خواتین میں شعور وآگاہی کے فروغ کے لیے مسلسل جدوجہد اور بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کے احساس کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں کشور ناہید کی خدمات کا ہر سطح پر اعتراف کیا جاتا ہے۔ کشور ناہید ۱۸ جون ۱۹۴۰ء میں بلند شہر (ہندوستان) میں ایک قدامت پسند سید گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد نے آٹھویں جماعت میں تعلیم کو خیر

آباد کہ دیا تھا۔ وہ راج گھاٹ نرودا کے مینجر تھے۔ کشور کے نانا فضل الرحمان وکالت کرتے تھے مگر لڑکیوں کی تعلیم کے قائل نہ تھے۔ ان کی والدہ نے اپنی اولاد کو تعلیم دلانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ کشور کے گھرانے میں عورتیں پردے کی پابند تھیں۔ ایک قدامت پسند گھٹے ہوئے ماحول میں پرورش پانے والی کشور ناہید نے اپنی زندگی کے تمام فیصلے روایت سے ہٹ کر کیے۔ تعلیمی دور میں تقریری مقابلوں اور مشاعروں میں حصہ لیتی رہیں اور ان کا کلام ادبی رسائل میں چھپتا رہا۔ پنجاب یونی ورسٹی سے معاشیات میں ایم۔اے کیا۔ کشور کی شادی ان کے یونی ورسٹی کے دوست یوسف کامران سے ہوئی۔ ان کے ازدواجی حالات کچھ ایسے خوشگوار نہیں تھے۔ کشور ناہید کے دو صاحب زادے ہیں۔ ان کے شوہر یوسف کامران ۱۹۸۴ء میں انتقال کر گئے۔

کشور ناہید نے اپنی شاعری میں ایسے نسوانی جذبات اور مسائل کا برملا اظہار کیا ہے جنہیں بیان کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک حقیقت پسند خاتون قرار دیتی ہیں۔ جو حالات یا معاشرے کے جبر کا شکار بننے سے منکر رہی ہیں۔ وہ عورت کے ساتھ روا رکھی جانے والی معاشرتی ناانصافیوں کو لگی لپٹی رکھے بغیر تلخ و ترش سچے الفاظ میں بیان کر دیتی ہیں۔ اکثر ناقدین ان کی شاعری کو سپاٹ، کھردری اور غنائیت سے محروم قرار دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عورت کا وجود، اس کا احساس اور اس کی آواز گونجتی ہے۔

لب گویا از کشور ناہید:

لب گویا کشور ناہید کا پہلا شعری مجموعہ کلام ہے جو ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۷۹ غزلیں اور ۳۸ دوہے ہیں۔ اسے خوب پذیرائی ملی۔ کشور کے کلام کا انگریزی اور ہسپانوی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کے لیے بھی لکھتی رہی ہیں۔

۱۔ باقی ماندہ خواب

۲۔ عورت زبان خلق سے زبان حال تک

۳۔ عورت خواب اور خاک کے درمیان

۴۔ خواتین افسانہ نگار ۱۹۳۰ء سے ۱۹۹۰ء تک

۵۔ زیتون

۶۔ آ جاؤ افریقہ

۷۔ بری عورت کی کتھا

۸۔ بری عورت کے خطوط:نوزائیدہ بیٹی کے نام

۹۔ سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ

۱۰ بے نام مسافت

۱۱۔ لب گویا

۱۲۔ خیالی شخص سے مقابلہ

۱۳۔ میں پہلے جنم میں رات تھی

۱۴۔ سوختہ سامانی ء دل

۱۵۔ کلیات دشت قیس میں لیلی

۱۶۔ لیلی خالد

۱۷۔ ورق ورق آئینہ

۱۸۔ شناسائیاں رسوائیاں

۱۹۔ وحشت اور بارود میں لپٹی ہوئی شاعری

۲۰۔ عورت مرد کا رشتہ (مکالمے اور تحریریں)

۲۱۔ زخم برداشتہ (پاکستان کہانی)

۲۲۔ گمشدہ یادوں کی واپسی

۲۳۔ کشور ناہید کی نوٹ بک

۲۴۔ آباد خرابا

۲۵۔ مٹھی بھر یادیں

۲۶۔ گستاخی

۲۷۔ *The distance of a shout*

۲۸۔ *The Culture and Civilization of Pakistan (2018)*

کشور ناہید نیشنل کونسل آف آرٹس کی ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر کام کرتی رہیں۔اس کے علاوہ کئی سال تک ادبی جریدے ماہ نو کی ادارت کے فرائض بخوبی انجام دیتی رہی ہیں۔ بعد ازاں ڈائریکٹر مرکزی اردو سائنس بورڈ لاہور کے عہدے پر بھی فائز رہیں۔آج کل اسلام آباد میں سکونت پذیر ہیں۔ کشور ناہید کو ان کی خدمات کے صلے میں بہت سے اعزازات سے نوازا گیا ہے۔ حکومت پاکستان نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔

۱۔ آدم جی ایوارڈ (لب گویا) ۱۹۶۹ء

۲۔ یونیسکو ادب برائے اطفال ایوارڈ (دیس دیس کی کہانی)

۳۔ کولمبیا یونیورسٹی (بہترین مترجمہ)

۴۔ منڈیلا ایوارڈ ۱۹۹۷ء

۵۔ ستارہء امتیاز ۲۰۰۰ء

آپ بیتی میں انسان کی داخلی اور خارجی کیفیات کا براہ راست اظہار ملتا ہے۔ آپ بیتی کی تعریف کے حوالے سے مختلف شخصیات کے نظریات ملتے ہیں۔ آپ بیتی کے ابتدائی نقوش ڈھونڈنے کی کوشش کریں تو شاید یہ سلسلہ اس عہد تک چلا جائے جب تحریر کا فن ایجاد ہوا تھا۔ مگر دیکھا جائے تو بطور صنف یہ جدید دور کی پیداوار ہے۔ اردو میں سب سے پہلے شائع ہونے والی خود نوشت تواریخ عجائب (کالا پانی) سنہ ۱۳۰۲ء ہجری میں منظر عام پر آئی۔ اگر دیکھا جائے تو برصغیر میں خود نوشت کا رواج ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہوا۔ اس مقالے میں جن آپ بیتیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔۔ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی قسم جزوی آپ بیتیوں پر مبنی ہے۔ان میں کالا پانی از مولانا جعفر تھانیسری، میرا افسانہ افضل حق، قید فرنگ حسرت موہانی، خون بہا حکیم احمد شجاع کو شامل کیا گیا ہے۔ دیگر آپ بیتیاں کسی حد تک مکمل اور زندگی کے ایک بڑے حصے کی ترجمان ہیں۔ ان میں داستان غدر از ظہیر دہلوی، آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ابوالکلام آزاد، آپ بیتی از خواجہ حسن نظامی، کارنامہ سروری نواب سرور جنگ، میری کہانی میری زبانی از سید ہمایوں مرزا اور اعمال نامہ از سید رضا علی، شہاب نامہ از قدرت اللہ شہاب شامل ہیں۔ اس کے علاوہ خواتین کی آپ بیتیوں میں ادراک ذات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جن میں بیتی کہانی از شہر بانو بیگم، کاغذی ہے پیرہن از عصمت چغتائی، رسیدی ٹکٹ از امرتا پریتم، جنت سے نکالی ہوئی حوا از نفیس بانو شمع، نوائے زندگی از ساجدہ زیدی، شورش دوراں از حمیدہ سالم کی آپ بیتیوں میں ادراک ذات کے ساتھ ساتھ اس دور کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی صورت حال کا جائزہ شامل ہے۔ ادا جعفری اور کشور ناہید کا تعارف اور شخصی خاکہ اس باب کا حصہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ https://en.m.wikipedia.org>pedia تاریخ ملاحظہ: ۱۵ اگست ۲۰۲۱ء۔

۲۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ (طبع سوم) (لاہور: مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ، اردو بازار، ۱۹۸۷ء)، ص ۱۱۷۔

۳۔ مولوی فیروزالدین، فیروز اللغات (لاہور: فیروز سنز، ۲۰۰۵ء)، ص ۶۔

۴۔ عبدالمجید قریشی، آپ بیتی اردو ادب میں (مضمون) (سہ ماہی الزبیر آپ بیتی نمبر بہاولپور، ۱۹۶۴ء)، ص ۲۹۔

۵۔ ڈاکٹر پرویز پروازی، پس نوشت اور پس نوشت (لاہور: نیازمانہ پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص ۲۶۔

۶۔ محمد طفیل، تصریحات (مضمون)، مطبوعہ: نقوش آپ بیتی (لاہور: ادارہ فروغ اردو، ۱۹۶۴ء)، ص ۳۰۲۔

۷۔ ابوالحسن علی ندوی، پیش لفظ، آپ بیتی از مولاناالماجددریا آبادی (کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۱۹۶۶ء)، ص ۶۔

۸۔ ڈاکٹر سلیم اختر، ادب اور لاشعور (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۲۰۹۔

۹۔ Oxford University *Oxford English Urdu Dictionary*، (امریکہ: آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۷۰ء)، ص ۸۰۔

۱۰۔ سید عبداللہ، اردو میں آپ بیتی، مشمولہ اردو نثر کا فنی ارتقا مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص ۳۵۰۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۵۰۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۵۲۔

۱۳۔ رفیع الدین ہاشمی، اصناف ادب (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۶۶۔

۱۴۔ ریحانہ خانم، اردو آپ بیتی کا فن (مقالہ برائے ایم اے اردو، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۲ء)، ص ۶۵۔

۱۵۔ صبیحہ انور، اردو میں خود نوشت سوانح حیات (طبع اوّل) (لکھنؤ: نامی پریس، ۱۹۸۲ء)، ص ۱۷۴۔

۱۶۔

۱۷۔

باب دوم:

خواتین مصنفین کی آپ بیتیوں میں معروضی رویوں اور انفرادی تشخص کا مطالعہ

باب دوم:

خواتین مصنفین کی آپ بیتیوں میں معروضی رویوں اور انفرادی تشخص کا مطالعہ

مرد قلم کاروں کی طرح خواتین نے بھی دیگر اصناف سخن کی طرح خود نوشت سوانح عمریاں لکھی ہیں جو نا صرف ان کی زندگی کا احوال بیان کرتی ہیں بلکہ تاریخی دستاویز کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ان خود نوشتوں میں اس عہد کی سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی اور روزمرہ کی زندگی کا عکس دکھائی دیتا ہے۔انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں خواتین کے لیے اردو صحافت کے دروازے کھلے ورنہ اس سے قبل خاتون صرف خاتون خانہ ہی ہوتی تھی۔ خواتین کا لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔خواتین کو صرف گھروں اور محلات کی زینت سمجھا جاتا تھا۔کسی بھی اہم فیصلے میں ان کا مشورہ لینا معیوب سمجھا جاتا تھا۔

دیگر اصناف کی نسبت خود نوشت سوانح عمری وہ واحد صنف ہے جس میں خواتین پہلے نمایاں ہوئیں اور شروع ہی سے سرگرم رہیں۔ان کی خود نوشتوں کو پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کو کس نظر سے دیکھتی تھی اور زمانے نے ان کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا؟اپنی ذات کی پہچان اور زمانے کی ستم ظریفیوں کو کس طرح برداشت کیا؟اتنے مصائب کی تند و تیز آندھیوں میں خود کو طاقت ور ثابت کیا اور ایک بیٹی، بہن، بیوی، اور ماں کا کردار نبھانے کے ساتھ ساتھ اپنے فرائض کو خوشی دلی سے نبھایا اور مرد کے شانہ بشانہ کھڑی رہیں۔اپنی خود نوشتوں میں انھوں نے نا صرف اپنے مسائل کو اجاگر کیا بلکہ اپنے ارد گرد موجود دوسری خواتین کے مسائل کی نشاندہی بھی کی۔تاریخی اور سیاسی زندگی سے وابستہ خواتین اپنی زندگی کے واقعات سے زیادہ تاریخی اور سیاسی حالات کا ذکر کرتی ہیں جو ان کی آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیتے ہیں۔عورت نے جب اپنی کیفیات کو بیان کرنا شروع کیا تو اس میں ایک نیا شعور جاگا۔خود نوشت نگاری خود شناسی کا عمل ہے۔اور خود نوشت انسان تب لکھتا ہے جب وہ زمانے کی دھول اور حالات کی آندھیوں سے نبرد آزما ہونے کے بعد ایک لمحہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ اس نے زندگی میں کیا کھویا کیا پایا۔خود نوشت لکھنا اخلاقی جرات کا کام ہے کیونکہ انسان کے لیے یہ بہت مشکل بات ہے کہ وہ اپنی غلطیوں اور حماقتوں کو زمانے کے سامنے لائے۔کسی بھی انسان کے لیے اپنی ذات کی سچائیوں کو پوری ایمانداری سے لکھنا مشکل مرحلہ ہے۔مرد حضرات بلا کم و کاست ہی یہ ہمت کر پاتے ہیں ایسے میں ایک عورت کے لیے یہ کام اور بھی مشکل ہے۔اور جن خواتین نے یہ جرات کی ہے وہ قابل تحسین ہیں۔اس باب میں ہم ایسی ہی خواتین مصنفین کی آپ بیتیوں کا جائزہ لیں گے۔

اگر قیام پاکستان سے پہلے کے دور کو دیکھا جائے تو بیگمات بھوپال کی آپ بیتیاں موجود ہیں۔نواب سلطان جہاں بیگم کی آپ بیتی جس کے تین حصے ہیں۔

۱۔ تزک سلطانی

۲۔ گوہر اقبال

۳۔ اختر اقبال

بیگمات بھوپال اپنے علم و فضل، بلند اخلاق اور سیاسی تدبر کے باعث برصغیر ہند کے وہ ستارے ہیں جن کو وہ مقام نہ مل سکا جو ان کا حق تھا۔ بھوپال کی حکمراں سکندر بیگم نے تزک بابری کی طرز پر تزک سکندری لکھنا شروع کی۔ جس کو وہ مکمل نہ کر سکیں۔اور ان کی بیٹی نواب شاہجہاں بیگم نے نظر ثانی کے بعد اس میں اپنے زمانے کے حالات کا اضافہ کر کے اسے تاریخ بھوپال کے نام سے شائع کیا۔اس کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنی نانی اور والدہ کے کام کو لے کر تزک سلطانی،گوہر اقبال،اور اختر اقبال کے نام سے آگے بڑھایا۔نواب سلطان جہاں بیگم کی خود نوشت ان کے خاندانی حالات،ان کے طرز عمل ان کی علم دوستی،اردو نوازی، تعلیم نسواں اور خاص طور پر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے سلسلے میں ان کی خدمات بحیثیت چانسلر اور ان کے معمولات زندگی پر مشتمل ہے۔سلطان جہاں بیگم علم کی جویا، عورتوں کی بیداری کی حامی اور مبلغ خاتون تھیں۔تزک سلطانی کا پہلا حصہ ابتدائی حالات سے ۱۹۰۳ء تک کے حالات پر مشتمل ہے۔دوسرا حصہ ان کے والد کے حالات کے بارے میں ہے۔اور تیسرے حصے میں ان کی شادی کا احوال درج ہے۔نواب سلطان جہاں بیگم کی تربیت میں ان کی نانی کا بڑا حصہ ہے۔انھوں نے امور خانہ داری کے ساتھ ساتھ گھڑ سواری اور تیر اندازی میں بھی مہارت حاصل کی۔نواب سلطان جہاں بیگم ایک روشن خیال خاتون تھیں مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنی نانی کے منتخب کردہ انسان سے شادی کی۔نواب سلطان جہاں بیگم نے بحیثیت حکمران اپنی رعایا کی بہت خدمت کی۔انہوں نے تعلیم نسواں پر بہت توجہ دی۔ مدرسہ سلطانیہ کے ایک جلسے میں عورتوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ :

> تمہاری تعلیم مصیبت کے وقت تم کو خود اپنی مدد کرنے کے قابل بنادے گی اور خدانخواستہ اگر تم میں سے کسی پر مصیبت کا وقت پڑے تو غیرت و حمیت کے ساتھ اپنی روزی خود پیدا کر سکو۔اور جب تم صاحب اولاد ہو تو اس کی تعلیم و تربیت اپنی گود سے شروع کر دو۔میری عزیز لڑکیو! یاد رکھو عمدہ تعلیم و تربیت تمہاری پونجی ہے۔دستکاری تمہارا زیور ہے۔اچھا اور شریفانہ اخلاق تمہارا حسن ہے۔جس لڑکی میں یہ صفات ہوں گی وہ ہر چھوٹے بڑے کی نظروں میں عزیز ہو گی!ان خوبیوں کے باعث دنیا کی کوئی مصیبت اور تکلیف نہ اس کو ذلیل کر سکتی ہے اور نہ کوئی دولت اس کو مغرور بنا سکتی ہے بلکہ تکلیف اور مصیبت میں استقلال اور عزت، دولت و حشمت میں انکسار تواضع پیدا ہو

گی۔[1]

وہ خواتین کے روایتی پردے کے حق میں نہیں تھیں۔ایسا پردہ جو انسان کو کاہل کر دے اور گوشہ نشین بنا دے وہ احمقانہ فعل ہے۔تاہم انہوں نے مغرب کی تقلید کو بھی پسند نہیں کیا۔اس کے مقابلے میں انہوں نے درمیانہ راستہ اختیار کرنے کا درس دیا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے منصب کو عیش و عشرت کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ اپنی عوام کی خدمت میں اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ مسلم یونی ورسٹی میں بطور چانسلر اپنی خدمات پیش کر کے ایک نئی تاریخ رقم کی۔

ان کی آپ بیتی پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے۔ایک عورت گھر چلانے کے ساتھ ایک پوری ریاست کو بہت اچھے طریقے سے سکتی ہے اور وہ کسی طور بھی مردوں سے کم نہیں۔نواب سلطان جہاں بیگم کی ہمہ جہت شخصیت ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔ خواہ وہ فرمانروائے ریاست کی شکل میں ہو یا بحیثیت ماہر تعلیم ، مصلح قوم یا غریبوں اور ضرورت مندوں کی ہمدرد کی حیثیت سے وہ صحیح معنوں میں ایک دانشور خاتون تھیں اور اپنے دور میں آنے والے زمانے کے بارے میں سوچتی تھیں ان کی یہی دور اندیشی ہی ان کی عظمت کا ثبوت تھی۔وہ جدید بھوپال کی معمار تھیں اور اس ریاست کی کئی نسلوں پر ان کا احسان ہے۔اپنے قلم سے اپنے دور کے حالات لکھ کر وہ اہل علم کے لیے بھی ایک ایسا تحفہ چھوڑ گئی ہیں جسے آنے والی نسلیں بیش بہا سرمائے کی طرح سنبھال کر رکھیں گی۔

نیرنگی بخت از وزیر سلطان بیگم:

نیرنگی بخت وزیر سلطان بخش کی مختصر خود نوشت ہے۔یہ ایک باعزت خاندان کی فرد تھیں اور ان کے والد شیخ عالم میاں جیلانی جالندھر کی انصاری برادری سے تعلق رکھتے تھے۔کتاب کا محور ان کی اپنی ذات ہے۔ جس میں ان کے آباؤ اجداد کی شان و شوکت اور ان کی ازدواجی زندگی کے تذکرے ہیں۔ان کی ازدواجی زندگی اتنی خوشگوار نہیں تھی جس کی وجہ سے ان کی اپنے شوہر سے علیحدگی ہو گئی۔ شوہر سے علیحدگی کے لیے انہوں نے عدالت کے ذریعے مہر کی رقم کا مطالبہ کیا۔اس خود نوشت میں اس دور کی سماجی اور سیاسی زندگی جھلکتی ہے۔یہ خود نوشت تین خاندانوں کے باہمی رشتوں کی کہانی ہے۔ جہاں ہر رشتے کا الگ الگ رنگ ہے۔ جہاں مزاجوں کا مختلف ہونا باہمی اختلافات کا سبب بنتا ہے اور نوک جھوک کے نتیجے میں ملنا بچھڑنا دونوں ہی ہیں۔ان کی تحریر میں غم والم اور بد نصیبی کے سائے ہونے کے باوجود امید کی کرنیں بھی نظر آتی ہیں۔وزیر سلطان بیگم اپنے حالات سے ہاری نہیں بلکہ صبر و استقامت سے کام لیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی رضا میں راضی نظر آتی ہیں۔ان کی تحریر میں سچائی ہے جو پڑھنے والوں کو متاثر کرتی ہے۔اچھی خود نوشت وہ ہے جس میں جس میں مبالغہ آرائی نہ ہو اور اپنے حالات و جذبات کو صاف اور سیدھے انداز میں بیان کیا جائے۔ یہ خود نوشت اس خصوصیت پر پوری اترتی ہے۔یہ خود نوشت مصنفہ کی زندگی کے کچھ حصوں کا

احاطہ کرتی ہے۔ جس میں وہ ایک مضبوط خاتون نظر آتی وزیر سلطان بیگم نے اپنی اس خود نوشت میں ایک ایسی عورت کا تصور پیش کیا ہے جو حالات کی کروٹوں سے گھبرانے کی بجائے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے۔ اور اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ سے بھی مدد طلب کرتی ہے۔

آزادی کی چھاؤں میں ازانیس قدوائی:

خواتین خود نوشت نگاروں میں ایک اہم نام بیگم انیس قدوائی کا ہے۔ وہ اردو کے مشہور و معروف مزاح نگار ولایت علی بمبوق کی بیٹی تھیں۔ ان کی شادی شفیع احمد قدوائی سے ہوئی۔ وہ ان کے ساتھ دہلی آ کر رہیں۔ خود نوشت آزادی کی چھاؤں میں پاکستان کے قیام اور تقسیم کے دوران ہونے والے فسادات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جیسے ہی لوگوں نے نقل مکانی شروع کی تو بلاؤں، مصیبتوں اور پریشانیوں نے لوگوں کو آ گھیرا۔ آزادی کے دوران دل دہلا دینے والے واقعات اس خود نوشت کا حصہ ہیں۔ بیگم انیس نے فساد زدہ ملک کا نقشہ ایسے کھینچا ہے کہ قاری خود کو ان حالات سے گزرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ آزادی ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران ان کے شوہر شفیع احمد قدوائی قیام امن کی کوششوں کے دوران مسوری میں شہید کر دیئے گئے۔

اپنے شوہر کی موت پر وہ لکھتی ہیں۔

> قاتل کو پکڑوا کر میں کیوں اس کی عورت کو بیوہ کروں اس کے بچوں کی یتیمی کا سبب بنوں۔ شاید اس کی ماں ہو تو اس کے تڑپنے کا سامان میں میرے ہاتھوں کیوں ہو۔ خدا پر ہی کیوں نہ چھوڑ دوں۔[۲]

اپنے شوہر کی موت کے دکھ کو کم کرنے کے لیے فسادات کے دوران انیس قدوائی نے ایک مددگار کے طور پر کام کیا۔ فساد زدگان کی امداد کرنے کے لیے پناہ گزینوں کے لیے کیمپ لگائے، انہیں بچانے اور ان کے رہن سہن کے لیے عملی طور پر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے آزادی کے دوران بگڑتے حالات اور انسانوں کی انسان کے ہاتھوں تباہی اور انسانیت پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کو اپنی نظروں سے دیکھا اور انہیں اپنی آپ بیتی کا حصہ بنایا۔ انہوں نے خود نوشت آزادی کی چھاؤں میں اپنی ذات پر بیتنے والے دکھوں اور اپنے ارد گرد ہونے والے مظالم کو بڑے دلدوز انداز میں بیان کیا ہے۔ ہندوؤں کی مسلمانوں کے لیے نفرت اور حقارت کے جذبات کو بھی اپنی خود نوشت میں بیان کرتی ہیں۔ وہ خود نوشت میں لکھتی ہیں۔

> یہ سالے پاکستان نہیں گئے، ابھی تک یہیں ٹہل رہے ہیں۔ دوسرا بولا: رہنے دو یار، ۱۵ جون کو ان کی قربانی کریں گے۔[۳]

اپنے تجربات کی روشنی میں وہ اس وقت کے سماج کی بگڑتی ہوئی حالت پر وہ لکھتی ہیں:

نظم و ترتیب کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا ہے۔ مذہب کی بنیادیں کھوکھلی ہو گئی ہیں۔ تہذیب و تمدن کی چولیں ہل چکی ہیں، پرانا سماجی نظام ختم ہو گیا ہے، بڑا اچھا ہوا۔ آخر وہ کب تک زندہ رہتا۔ کوئی کچھ کہے، اس کو تو مرنا ہی تھا۔ لیکن اندیشہ اور افسوس تو یہ ہے کہ اب جو سماج بن رہا ہے وہ آدمیوں کی سوسائٹی نہیں، جانوروں کا جنگل ہو گا۔ انسانی برادری وحشتوں کے غول میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔[۴]

یہ بے روح سماج، یہ غنڈہ تہذیب، یہ لٹیا پاجامہ والا تمدن، اور یہ ایک کلچر، ایک قوم کا خواب دیکھنے والے دماغ، ان سب کو نئے ہندوستان کے کھیتوں کی کھاد بنانا ہی پڑے گا۔ اس کے بغیر زمیں میں طاقت کیسے پیدا ہو گی۔[۵]

یہ کتاب ہندوستان کی تاریخ کے اہم دور پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے دو سال کے عرصے کے آنکھوں دیکھے احوال قلم بند کیے ہیں مگر یہ دو سال نہیں بلکہ دو ملکوں کی خونی تاریخ کا نوحہ ہیں، جس کے ہر منظر نامے میں وہ خود نظر آتی ہیں۔ یہ سوانح عمری کم اور آزادی کی داستان زیادہ لگتی ہے۔ اسی لیے اسے خود نوشت کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ خود نوشت میں وہ ایک رحم دل خاتون کے طور پر نظر آتی ہیں۔ جنہوں نے اپنا شوہر کھو دینے کے باوجود حوصلے کا دامن نہیں چھوڑا اور دوسروں کی مدد کر کے اپنا غم غلط کرتی رہیں۔

سلسلہ روزو شب از صالحہ عابد حسین:

بیگم صالحہ عابد ایک مشہور افسانہ نگار اور ادیبہ ہیں۔ بیگم صالحہ عابد مولانا الطاف حسین کی نواسی ہیں۔ اور ان کی یہ خود نوشت ۱۹۸۴ء میں نئی دہلی سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب مصنفہ کے طویل سفر حیات کی کہانی ہے۔ ناول نگار اور افسانہ نگار ہونے کی وجہ سے انہوں نے اپنی یہ خود نوشت نہایت دلکش اور سادہ پیرائے میں اپنی زندگی اور ماحول کے بارے میں لکھی۔ جزئیات نگاری اور کردار نگاری ایسی ہے کہ ناول کا گمان ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کی سچائیوں اور پانی پت کے ماحول کو دلچسپ اور شگفتہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ دلی، جامعہ ملیہ کے ماحول اور اپنے خاندانی پس منظر کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے قدیم رنگ معاشرت جہاں بچیوں کو بہت چھوٹی عمر میں ہی پردے کا پابند کر دیا جاتا ہے۔ ان کی تعلیم کا انتظام گھروں کی چار دیواری کے اندر ہی کیا جاتا تھا اس کی عکاسی کی ہے۔ ان کی تحریر میں ان کے بچپن کی جھلک نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنے بچپن سے جڑی ہر بات تفصیل سے لکھی ہے۔ ایک جگہ جہاز میں اپنے سفر کی تفصیل کچھ یوں لکھتی ہیں۔

جہاز میں ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی، انگریز اور غریب اور امیر، عورت، بچے سبھی تھے اور

میں نے پہلی بار محسوس کیا، سوالباس کے سب لوگ ایک سے تو ہیں۔ آٹھ سال کی عمر میں برقعہ
اوڑھتی تھی۔[٦]

صالحہ عابد حسین کی زیادہ تر تعلیم گھر پر ہی ہوئی تھی صرف انگریزی اور حساب پڑھانے کے لیے ایک استاد گھر پر بلایا جاتا تھا۔ اور بہت سی کتابیں پڑھنے کی اجازت لڑکیوں کو نہیں تھی۔ مثلاً امراؤ جان ادا اور فسانہ آزاد انہوں نے چھپ کر پڑھا۔ اپنے دور کے حالات و واقعات اور اس وقت کے اپنے سکول کا نقشہ ایسا کھینچا ہے کہ آنکھوں دیکھا حال لگتا ہے۔ آپ بیتی میں ہر بات تفصیل سے لکھی۔ اپنی ماں کی بیماری کے بارے میں وہ لکھتی ہیں کہ:

اماں کی بیماری بڑھ رہی تھی، مگر میں انجان تھی۔ البتہ ان کی کھانسی کی آواز میری روح میں اترتی
محسوس ہوتی تھی۔ ١٩٤٨ء سے آج تک دمہ کے مرض میں مبتلا ہو کر ان کی وراثت میں شدید
کھانسی کے کرب اور صبر میں مجھے بھی خدا نے حصہ دار بنایا۔[٧]

ماں اور جوان بہن کی موت کا غم انہیں نڈھال کر گیا۔ اور ان کی جدائی ان کی شخصیت میں ایسی تبدیلیاں لے کر آئی کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ حساس عورت بن گئیں۔ وہ دوسروں کے دکھوں کو اور زیادہ محسوس کرنے لگیں۔ ان کی شادی ان کے بھائی کے دوست سے ہوئی جو عمر میں ان سے کافی بڑے تھے۔ اور یہ ان کے شوہر کی دوسری شادی تھی۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد ایک بیٹی کی پیدائش اور موت نے ان کے غم میں مزید اضافہ کر دیا۔ بیٹی کی موت سے زیادہ انہیں اس بات کا دکھ تھا کہ وہ اپنی بیماری کی وجہ اپنی بیٹی کا منہ بھی نہ دیکھ سکیں۔ وہ اپنے دکھ کو اپنے قلم کے سہارے کم کرنے کی سعی کرتی رہیں وہ لکھتی ہیں۔

میری زخمی ممتا کی چیخ کسی نے نہ سنی۔ میرے دل کی بھڑکتی ہوئی آگ کی لپٹ کو کوئی نہ محسوس کر
سکا۔ یہ نہیں کہہ سکتی کہ میرے حد سے زیادہ حساس ہونے کی وجہ تھی یا آئندہ اس نعمت سے
محروم رہنے کا سبب لیکن اتنا جانتی ہوں کہ یہ آگ، یہ تڑپ، یہ بے قراری اور غم میں لذت، کسی
اور دکھ اور غم میں حاصل نہ ہوئی۔ اگر میرا قلم میرے پاس نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔[٨]

صالحہ عابد حسین ایک مہذب گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں انہوں نے کبھی بھی اپنی اعلیٰ روایات کا دامن نہیں چھوڑا۔ شادی کے بعد انہوں نے خندہ پیشانی اور ثابت قدمی سے حالات کا سامنا کیا۔ سسرال میں ایک خدمت گزار بہو ہونے کا حق ادا کیا۔ بڑے گھر سے ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی اپنی ذات میں غرور کو دخل نہیں کیا۔ اپنے شوہر کی پہلی بیوی کا ذکر وہ بڑے ہمدردانہ انداز میں کرتی ہیں۔ اس سے ان کی اعلیٰ ظرفی کا پتہ چلتا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت سی بیماریاں دیکھیں مگر ہمت نہ ہاریں۔ ان کی خودنوشت میں ان کے شوہر کا عکس نظر آتا ہے۔ انہوں نے ان کا ذکر ایک شفیق اور ہمدرد انسان کے طور پر کیا۔ جو پہلی بیوی سے قطع تعلقی کے باوجود انہیں خرچہ بھیجتے تھے۔

صالحہ عابد حسین نے اپنی گھریلو مصروفیات کے علاوہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تصنیف وتالیف میں گزارا۔اس خود نوشت میں ان کا کردار ایک بے لوث پیار کرنے والی اور اور خدمت گزار خاتون کا ہے۔ جنہوں نے میکے اور سسرال میں اپنی محبت کے پھول یکساں بکھیرے۔ادبی، تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے یہ ایک منفرد خود نوشت ہے۔

ڈگر سے ہٹ کر از سعیدہ بانو احمد:

سعیدہ بانو احمد لکھنؤ میں پیدا ہوئیں۔ان کا گھرانہ ایک خوشحال گھرانہ تھا۔اس خود نوشت میں سعیدہ کی زندگی کے علاوہ بھوپال شہر کی تاریخی و تہذیبی، سیاسی و سماجی اہمیت کی تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ مصنفہ نے اپنے لڑکپن کے دور کی لکھنؤ کی زندگی کی معاشرت کا نقشہ بہت جزئیات نگاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سعیدہ کی یہ خود نوشت جیسا کہ اس کا نام ہے۔ان کی زندگی بھی بالکل ویسی ہی تھی یعنی ڈگر سے ہٹ کر۔ان کا تعلق بھی ایک روایتی خاندان سے تھا۔ جس میں لڑکیوں کی خود مختاری کا کوئی تصور نہیں تھا۔ مگر انہوں نے اپنی زندگی ایک غیر روایتی انداز میں گزاری۔اپنی پڑھائی کو آگے بڑھانے کا شوق رکھنے کے باوجود ان کی شادی کر دی گئی۔ جب ان کی شادی ہوئی وہ مرد کی نفسیات اور ازدواجی زندگی کی اہمیت سے ناواقف تھیں۔ شادی کی پہلے رات اپنے شوہر کے ساتھ کیے گئے سلوک نے ان کی آئندہ زندگی میں تلخیاں اور ناخوشگواریاں پیدا کر دیں۔ان حالات نے آگے چل کر ان کی ازدواجی زندگی کو ناقابل عمل بنا دیا۔ وہ اپنی شادی کی رات کا احوال کچھ یوں لکھتی ہیں:

> میں چاہتی ہوں میں اور آپ دوستوں کی طرح رہیں پھر جب ہم میں آپ میں واقفیت ہو جائے تو دیکھا جائے گا۔[9]

ان دنوں کو یاد کر کے مصنفہ اپنے اس رویے پر شرمندگی محسوس کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ:

> آج میں سوچتی ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ ابن صاحب کے لیے میرا یہ رویہ کس درجہ ناقابل قبول تھا۔ وہ کس قدر روح فرسا کیفیت سے گزرے ہوں گے۔ والدین کی طے کی ہوئی شادی کی بنیاد اور ساری خوشیاں جنسی ناطے کی آسودگی پر مبنی ہوتی ہیں۔[10]

سعیدہ بانو ایک خدمت گزار بہو تھیں۔اور اپنے سسر کی آنکھ کا تارا تھیں۔ وہ اکثر ان سے مختلف موضوعات پر ان سے باتیں بھی کرتے تھے۔ سعیدہ زیادہ پڑھی لکھی خاتون نہیں تھی مگر ان کے سسر کے دیئے ہوئے اعتماد نے ان کی زندگی کو خوشگوار بنانے میں مدد کی۔ سعیدہ لکھتی ہیں کہ اگر میرے سسر کچھ دن اور زندہ رہ جاتے تو ان کی زندگی میں جو کچھ ہوا وہ نہ ہوتا۔ ساجدہ اپنے شوہر اور اپنی ناپختگی کے بارے میں لکھتی ہیں۔

> ابن میاں سیدے سادھے انسان تھے ان کے سوچنے کا ڈھنگ بھی بندھے ٹکے رسم و رواج کا پابند تھا۔غلط میں ہی تھی۔ مگر اس کو کیا کروں کہ اس وقت میں کم عمر تھی۔اور حکمت عملی کا گر نہیں

آتا تھا۔۔۔شب کے اختلاط کے بعد یہ الجھ پڑتے پھر چین سے سو جاتے اور میں جاگتی رہتی۔ایسے میں میری ناپختہ کار عقل مجھے بے چین رکھتی۔میں ان کے طریقہ زندگی اور اپنے میکے کے ماحول کا موازنہ کرتی تو سب سے نمایاں فرق یہ نظر آتا کہ عباس رضا کے کوئی مشغلے نہ تھے سوائے کچہری جانے کے اور ضرورت پڑنے پر قانون کی کتابوں کا مطالعہ کر لینا۔میری سسرال میں سخت پردہ تھا اور میرے کھیل کود ٹینس ،بیڈمنٹن بھولی بسری باتیں ہو چکی تھیں۔بس کتابیں پڑھتی رہتی تھی۔[11]

سعیدہ بانو نے اس دور کے مردوں کی بے راہ روی کا نقشہ بہت صاف کھینچا ہے۔جس میں انہوں نے اپنے جیٹھ کی عاشقانہ طبیعت کا ذکر کیا ہے۔اور یہ عشق اکثر انہیں شادی شدہ خواتین سے ہی ہوتا تھا۔جو زیادہ تر ان کے دوستوں کی بیویاں تھیں۔سعیدہ بانو نے لکھنؤ میں ریڈیو اسٹیشن پر بھی کام کیا۔

شادی کے بعد سسرال میں انہوں نے جو ماحول دیکھا وہ اس ماحول کی عادی نہیں تھیں۔ان کی شادی جس شخص سے ہوئی وہ بدمزاجی کے ساتھ ساتھ احساس کمتری کا شکار بھی تھے۔مگر بچوں کی خاطر وہ نبھا کرنے کی سعی کرتی رہیں۔مگر جب یہ رشتہ نبھانا ناممکن ہو گیا تو انہوں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی۔علیحدگی کے بعد بھی وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اور خاندانی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے نبھاتی رہیں۔ان کا خاندان مالی اعتبار سے مستحکم تھا مگر انہوں نے کبھی کسی سے مدد نہ لی۔انہوں نے اپنی محنت اور خود اعتمادی سے اپنے بچوں کی تربیت کی۔سعیدہ بانو نے دوسری شادی بیرسٹر نورالدین احمد سے کی۔اس خودنوشت میں انہوں نے ازدواجی زندگی کی ناہمواریوں اور اس کے عبرت ناک انجام سے لوگوں کو روشناس کروایا ہے۔انہوں نے بے باک انداز میں یہ خودنوشت لکھی۔اور اپنی زندگی کو زمانے کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔اور ایک مضبوط عورت کے طور پر خود کو منوایا۔

جنت سے نکالی ہوئی حوّا از نفیس بانو شمع:

نفیس بانو شمع غازی پور (یوپی) کے بھتری قصبہ میں پیدا ہوئیں۔نفیس بانو کی پوری زندگی غم والم کی داستان ہے۔ان کے والد کا کسی اور عورت کی طرف رجحان پیدا ہو گیا اور اس عورت کی شرط کو پورا کرنے کے لیے ان کے والد نے ان کی والدہ کو طلاق دے کر تین بچوں سمیت میکے رخصت کر دیا۔اور کچھ عرصے کے بعد ان کے چھوٹے بھائی کا انتقال ہو گیا اور ان کے نانا نے ان کی والدہ کا نکاح کہیں اور کر دیا اور چھوٹی بہن بھی والدہ کے ہمراہ بھیج دی گئی۔اور نفیس بانو کی پرواش ان کے نانا اور ماموں نے کی۔اور ان کی شادی ایک نواب سے کر دی گئی۔مگر یہ شادی بھی ان کے لیے خوشیوں کا سامان پیدا نہ کر سکی اور ان کے شوہر نے شادی کی پہلی رات ہی یہ خبر سنائی کہ وہ کسی اور کا خواب ہیں اور اس شادی کے لیے انہیں مجبور کیا گیا ہے۔نفیس نے یہ بات اپنے گھر والوں کو بتائی مگر انہوں نے اسے یہ بات کہہ کر

سسرال واپس بھیج دیا کہ مرد چار چار شادیوں کا حق رکھتا ہے۔ تمہیں بس تمہارا خرچ ملتا رہے اسے ہی غنیمت جان کر گزر بسر کرو۔ بعد میں اس بات کا پتہ چلا کہ ان کے شوہر کسی ایک کا نہیں بلکہ کئی عورتوں کا خواب ہیں۔ ان کے شوہر نے انہیں ایک فالتو چیز سمجھ کر گھر میں رکھا جہاں ان کی بیوی ان سے کوئی سوال کرنے کا حق نہیں رکھتی تھی۔ ان حالات سے دل برداشتہ ہو کر نفیس بانو نے ایک بار نہیں بلکہ کئی بار زہر بھی کھائی مگر موت نے بھی ان کو قبول نہیں کیا اور بالآخر انہوں نے ایک پیر صاحب صوفی لیاقت حسین کی مریدی اختیار کی۔ اور ان کی نصیحتوں اور وظائف نے انہیں ذہنی سکون دیا۔ ان کی تحریروں سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں حضور پاک اور اولیاءاللہ سے بے پناہ محبت و عقیدت تھی۔ انھوں نے اپنی خود نوشت میں ظلم و جبر کے خلاف احتجاجی آواز کو بلند کیا۔ اور نہایت شائستگی کے ساتھ ادبی زبان میں اپنے بزرگوں کے رویوں پر تنقید کی۔ خواتین سے ہونے والی زیادتیوں اور استحصال کو موضوع بنایا۔ اپنی اس خود نوشت میں انہوں نے جن نسوانی کرداروں کو پیش کیا ہے وہ مظلوم و مجبور اور زمانے کی ستم ظریفیوں کا شکار ہیں۔ ان میں زندگی کی خواہش ختم ہو چکی ہے۔ انھوں نے نا صرف اپنی ذات پر بلکہ اپنے ارد گرد ہونے والے مظالم کو بے باکی سے پیش کیا ہے۔ نفیس بانو کی آپ بیتی ان کی ذات تک محدود نہیں بلکہ پوری دنیا کی عورت ذات کی آپ بیتی بن گئی ہے۔ انھوں نے سماج میں بے آبرو ہوئیں عورتوں کا ذکر بڑے پر درد الفاظ میں کیا ہے۔ اس خود نوشت کے متعلق ڈاکٹر وہاج الدین کی رائے ہے۔

> نفیس بانو شمع کی خود نوشت اس لحاظ سے ایک اچھی خود نوشت ہے کہ اس میں بیانیہ کی تکنیک اور افسانوی انداز میں اپنی زندگی کی کہانی دہرائی گئی ہے۔ واقعات کی صداقت کے پیش نظر مصنفہ نے مشرقی روایات کا گلہ نہیں گھونٹا ورنہ بہت سے مواقع ایسے آئے تھے جہاں وہ الفاظ کے ذریعے لذتیت پیدا کر سکتی تھیں۔ اس خود نوشت میں متوسط اور نچلے متوسط طبقے کی عکاسی کی گئی ہے۔ خود نوشت نگار نے شعوری طور پر ان طبقات کی کمزوریوں، محرومیوں، ناکامیوں اور ان سے پیدا ہونے والی نفسیات کو اپنی ذات کے حوالے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ [12]

مردوں کی بے باکیاں اور معاشرے میں انہیں ہر قسم کی دی گئی چھوٹ کا ذکر کچھ اس طرح کرتی ہیں۔

> ہمارے معاشرے میں مرد کے لیے تو بہت وسعت ہے، لیکن عورت کے لیے دوسری تیسری شادی کرنے کا تصور ہی غلط سمجھا جاتا ہے۔ کسی عورت کو شوق نہیں ہوتا کہ وہ مختلف بستروں کی زینت بنے۔ مرد کی کمزوری عورت ہے تو عورت کے لیے سب سے بڑا سہارا مرد کا ہوتا ہے۔ [13]

انھوں نے واقعات کے بیان میں کسی خوف اور جھجک کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے مردوں کے ظلم و ستم اور عورتوں کی لاچاری اور بے بسی کی کیفیت کو شدت اور درد مندی کے ساتھ بیان کیا۔ کیونکہ ان کی بچپن اور جوانی دونوں مردوں کے ستائے ہوئے رویوں کی نظر ہو گئیں۔ اور وہ کبھی بھی اپنی زندگی سے مطمئین نہ ہو

سکیں۔ان کی زندگی ناآسودگی اور بے اطمینانی کی داستان بن کر رہی۔انھوں نے مرد کی ہر صورت کو خواتین کا استحصال کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ نفیس بانو کی یہ خود نوشت ایک درد مند دل کی صدا ہے۔

کاغذی ہے پیرہن ازعصمت چغتائی:

عصمت کی پیدائش بدایوں اور پرورش جودھ پور میں ہوئی۔بھائیوں کے ساتھ پرورش پانے کی وجہ سے ان میں زیادہ تر عادات لڑکوں والی تھیں۔ان کی والدہ لڑکیوں کی تعلیم کی حامی نہیں تھی۔ مگر عصمت نے ضد کی اور انہیں راضی کر لیا۔ عصمت نے علی گڑھ اور لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ عصمت چغتائی نے سماجی جبر و استحصال کو محسوس کیا۔انہوں نے متوسط طبقے کی خواتین کے مسائل کو قریب سے دیکھا اور اپنی تخلیقات میں انہیں پیش کیا۔ مشرقی خواتین کی بے بسی، لاچاری اور محرومیاں دیکھ کر وہ دکھ کا اظہار کرتیں۔اور ان کی تخلیقات کے موضوعات بھی خواتین پر ہونے والے جبر و مظالم، ذہنی، جسمانی، جنسی استحصال پر مشتمل ہیں۔کاغذی ہے پیرہن عصمت کی یادوں اور خاندان کی سنی سنائی باتوں کا مجموعہ ہے۔ عصمت کو بچپن ہی سے ظالم اور مظلوم کی تمیز ہو گئی تھی۔ عصمت بچپن ہی سے حساس اور گہرے مشاہدات رکھنے والی تھیں۔اس حساس طبیعت نے انہیں چیزوں کو گہرائی سے دیکھنے اور سمجھنے کا عادی بنا دیا۔ معاشرے میں موجود بے کاری اوور غریبی نے لوگوں کو امیروں کا غلام بنا دیا تھا۔امیروں کے ہاتھوں غریبوں کا استحصال اپنے ارد گرد ہونے والے مظالم کا ذکر کچھ یوں کرتی ہیں:

> اپنے بچپن میں میں نے نوکروں کی ایسی درگت دیکھی کہ مجھے آقا اور نوکر کے نظام سے ہی نفرت ہو گئی۔[14]

عصمت اپنے بچپن کی یادوں کو حسین یادوں سے تعبیر نہیں کرتیں کیونکہ ان کے معصومانہ ذہن میں اٹھنے والے سوالوں کا جواب مار کی صورت میں دیا جاتا۔ عصمت میں اپنے بھائیوں کی برابری کرنے کا جذبہ بہت زیادہ تھا۔اور یہ برابری انہوں نے تعلیم کے میدان میں نا صرف پوری کی بلکہ ان سے آگے نکل گئیں۔ان کا مطالعہ اس قدر وسیع تھا کہ وہ اپنے والد کے دوستوں کے ساتھ مختلف موضوعات پر گفتگو کرنے لگیں۔ عصمت کی والدہ ان کی اس خود اعتمادی کو خرابی کا نام دیتی کہ بیٹی پڑھ لکھ کر خراب ہو گئی ہے۔اپنی والدہ کی پریشانی کو یوں لکھتی ہیں:

> میری اماں کو میری حرکتیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ میرے انجام کی انہیں سخت فکر تھی۔ یہ مرد مار عورتیں زیب نہیں دیتیں۔ وہ اتنی گہرائی سے نہ ان باتوں کو سمجھتی تھی اور نہ سمجھا سکتی تھیں مگر مجھے معلوم ہوا کہ میری اماں کیوں ڈرتی تھیں۔ یہ مرد کی دنیا ہے ،مرد نے بنائی اور بگاڑی ہے۔ عورت ایک ٹکڑا ہے۔اس کی دنیا کا جسے اس نے اپنی محبت اور نفرت کے اظہار کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ وہ اسے موڈ کے مطابق پوجتا بھی ہے اور ٹھکراتا بھی ہے۔[15]

عصمت کو مجبوریوں میں بندھے رشتوں سے نفرت تھی۔ وہ مردوں کے بنائے ہوئے اصولوں اور بندشوں سے گھٹن محسوس کرتی تھیں۔ وہ عورت ذات سے جڑی کسی بھی قسم کی مجبوری کو دھوکے اور فریب کا نام دیتی ہیں۔ انہوں نے مرد اور عورت کی نفسیات کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔

عصمت کا اپنے بڑے بھائی عظیم بیگ سے تعلق دوسرے بہن بھائیوں کی نسبت زیادہ مضبوط تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ ان دونوں کا آزاد خیال ہونا تھا۔ اس کی مثال ان کے چھوٹے بھائی کی شادی کے موقعے ریل میں برقعہ کی ٹوپی گمانے پر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرانا تھا۔ کیونکہ عظیم بیگ پردے کے خلاف تھا اور عصمت کو بھی نقاب کرنا پسند نہیں تھا۔ عصمت نے اپنی پھپھو اور ان کی بیٹیوں کے بارے میں بھی تفصیل سے لکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں اپنی اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنے گھر والوں کو کیسے راضی کیا۔ اپنے بی۔ اے کے نتیجے کے آنے پر جس میں ان کا بھائی شمیم فیل ہو جاتا ہے اور عصمت پاس ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی والدہ کے تاثرات لکھتے ہوئے کہتی ہیں کہ میری والدہ کہتی ہیں مجھ کم بخت کا پاس ہونا کس کام کا۔ میں فیل بھی ہو جاتی تو کیا تھا میرا بھائی پاس ہو جاتا۔ عصمت کے والد کا تبادلہ جس جس جگہ ہوا عصمت نے وہاں کے رہن سہن، ثقافتی، معاشرتی زندگی کی بھرپور انداز میں عکاسی کی ہے۔ عصمت نے بی۔ اے کے بعد جہاں جہاں بطور استاد نوکری کی اس کا ذکر بھی کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ عصمت نے اپنے زمانے کی مشہور شخصیات کا ذکر بھی کیا جن سے ان کا تعلق تھا۔ عصمت کی حق گوئی اور بے باک طبیعت نے ان کے بہت سے مخالفین بھی پیدا کر دیئے تھے۔ اور لحاف کی اشاعت نے انہیں کس مصیبت میں ڈال دیا اس کا ذکر بھی اس خود نوشت میں موجود ہے۔

رسیدی ٹکٹ ازامرتا پریتم:

امرتا پریتم پنجابی زبان کی شاعرہ اور افسانہ نگار تھیں۔ امرتا کی پیدائش گجرانوالا میں اور پرورش لاہور میں پائی۔ یہ خود نوشت رسیدی ٹکٹ مصنفہ کی عالمگیر شخصیت کے حوالے سے اہم ہے۔ امرتا کا انداز تحریر بے باک اور اسلوب سادہ ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو من و عن بیان کر دیا ہے۔ امرتا نے اپنی زندگی کو صرف اپنی مرضی سے گزارا ہے۔ وہ اپنے خاندان کے حالات لکھتے ہوئے بتاتی ہیں کہ ان کے والد بچپن میں ہی یتیم ہو گئے تھے۔ ان کے والد بہت ہی سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ امرتا ان کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ ان کے والد شاعر تھے اور پیو کھ تخلص کرتے تھے۔ امرتا اپنے والد کے بارے میں لکھتی ہیں کہ فقیری اور امیری دونوں میرے پتا کے مزاج میں تھیں۔[16]

امرتا نے اپنی پیدائش کے بارے میں لکھا کہ وہ اپنے والدین کی شاگردوں کی دعا کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ امرتا نے بچپن ہی سے انقلابی اور احتجاجی مزاج پایا تھا۔ اس حوالے سے وہ ایک واقعہ لکھتی ہیں کہ ان کے رسوئی گھر میں ان کی نانی

مسلمانوں کے لیے الگ سے برتن رکھتی تھیں جن کو استعمال کے بعد الگ رکھ دیا جاتا تھا۔ امرتا نے اسی گلاس میں پانی پینے کی ضد کی اور گھر والوں کو ہار ماننا پڑی اور اس طرح سارے برتن مل گئے۔ وہ لکھتی ہیں کہ اس کے بعد کوئی برتن نہ ہندو رہا نہ مسلمان۔[۱۷]

امرتا لکھتی ہیں کہ انہیں کیا معلوم تھا ان کے گھر والے جس مذہب کے لوگوں کے چھوئے ہوئے برتنوں کو اچھوت سمجھ کر الگ رکھتے ہیں اسی مذہب کے انسان سے انہیں پیار ہو جائے گا۔ مشرقی لڑکیوں کی طرح امرتا نے بھی ایک خوابوں کی دنیا بسا رکھی تھی۔ جس میں ایک حسین شہزادے کا تصور ہمیشہ رہتا ہے۔ امرتا نے بھی ایک ایسے ہی شہزادے کا تصور باندھ رکھا تھا جسے وہ راجن کا نام دیتی ہیں۔ امرتا نے اپنی جوانی کے سالوں کو ایک استعارہ بنا کر پیش کیا محبت کے احساس کا استعارہ، ان کا ایک خوبصورت جملہ ہے کہ یہ سولہواں سال آج بھی میری عمر کے ہر سال میں شامل ہے۔ انسان کی عمر کا یہ حصہ خواہشوں، تمناؤں اور آرزوؤں کو پا لینے کا ہے اور انسان غلط اور صحیح کا فیصلہ نہیں کر پاتا۔ اپنے معاشرے کے بارے میں نظریات کے بارے میں وہ لکھتی ہیں کہ خواتین کے دماغ میں بچپن ہی سے یہ بات ڈال دی جاتی ہے کہ مرد کے بغیر وہ کچھ نہیں ہیں۔ مرد کے بغیر ان کا ہر خواب ادھورا ہے۔ حقائق کو لکھنے کا امرتا کا اپنا ہی الگ انداز ہے۔ امرتا ایک ایسے گھرانے کی بیٹی تھی جہاں روایات کی پاسداری ضروری تھی ان روایات کی زنجیروں کو توڑ کر اپنی محبت کی تلاش میں نکلی۔ جس محبت کے خواب وہ بچپن سے دیکھتی آ رہی تھی۔

امرتا کے خوابوں کا شہزادہ ساحر لدھیانوی کی صورت میں ان کی زندگی میں آیا۔ بلوغت کی عمر کو پہنچتے ہی بے جا پابندیوں نے امرتا کو بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ امرتا کی ساحر سے ملاقات ایک مشاعرے میں ہوئی۔ دونوں کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ساحر کے لیے امرتا نے اپنے جذبات کو بڑی بے باکی اور خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

> دل کی تہوں میں سب سے پہلا درد جس کے چہرے کی تابانی میں دیکھا، وہ اس مذہب کا تھا، جس مذہب کے لوگوں کے لیے گھر کے برتن بھی اچھوت قرار دے دیئے جاتے تھے۔ یہی چہرہ تھا جو میرے اندر کے انسان کو اتنا فراخ بنا گیا کہ ہندوستان کی تقسیم کے وقت، تقسیم کے ہاتھوں تباہ ہو کر بھی، دونو مذاہب کے ظلم، بنا کسی رعایت یا جانبداری کے تحریر کر سکی۔ یہ چہرہ نہ دیکھا ہوتا تو "پنجر" ناول کی تقدیر جانے کیا ہوتی۔[۱۸]

ساحر سے محبت کی انتہا یہ تھی کہ ازدواجی زندگی سے مطمئن ہونے نے باوجود امرتا کے خیالوں سے ساحر کی یادوں کے جال کو کوئی نہ نکال سکا۔ مگر اس شہزادے نے ان سے وفا نہ کی۔ محبت میں ناکامی کے سبب وہ کافی عرصے تک ذہنی اذیت سے دوچار رہیں۔ امرتا کی شادی ان کے دوست امروز سے ہوئی۔ وہ امروز کو ہمیشہ ایک اچھا دوست سمجھتی رہیں۔ ساحر کی بے وفائی کے زخم پر امروز کا ساتھ ایک مرہم ثابت ہوا۔ وہ لکھتی ہیں

جانتی ہوں۔۔۔۔۔اس سے اگلے سالوں نے جو انصاف مجھ سے کیا، وہ مجھ سے جدا ہوئے میرے ہمسفر کے ساتھ نہیں کیا۔ مجھ کو اس سے اگلے برسوں میں امروز کی حسین تر رفاقت حاصل ہو گئی۔ لیکن اس کو صرف تنہائی ملی۔ اس کو کچھ بھی دیتے وقت زندگی کے ہاتھ کنجوس ہو گئے۔[19]

وہ ساحر کے بارے میں اتنا سوچتی تھیں کہ ان کا بڑا بیٹا ہو بہو ساحر کی طرح دکھتا تھا۔

اخباروں اور کتابوں میں کئی ایسی گھٹنائیں پڑھی ہوئی تھیں، کہ ہونے والی ماں کے کمرے جس طرح کی تصویریں ہوں یا جیسی شکل کی وہ من میں کلپنا کرتی ہو، بچے کی صورت ویسے ہی ہو جاتی ہے، اور میری کلپنا نے جیسے دنیا سے چھپ کر دھیرے سے میرے کان میں کہا۔ اگر میں ساحر کے چہرے کا ہر وقت دھیان کروں، تو میرے بچے کی صورت اس سے مل جائے گی۔ جو زندگی میں نہیں پایا تھا، جانتی ہوں یہ اسے پالینے کی ایک طلسماتی کوشش تھی۔[20]

انہوں نے اپنی اس خود نوشت میں بہت سے ممالک کی سیر کا بھی ذکر کیا۔ بالخصوص سوشلسٹ ممالک جن میں سوویت یونین اور یوگوسلاویا قابل ذکر ہیں۔ اس خود نوشت کی وجہ سے انہیں مقبولیت اور شہرت ملنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا، مگر وہ ان تمام مخالفتوں کو پس پشت ڈال کر اپنی تخلیقی سرگرمیوں میں سرگرم رہیں۔ امرتا کے شوہر نے آخری دم تک ساتھ دیا۔ امرتا نے اپنے ادبی سفر کے حالات وواقعات اور زندگی کے مختلف نشیب و فراز، ملک کے بدلتے حالات کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

میرا بچپن از عذرا عباس:

عذرا عباس کا شمار اردو کے جدید شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کی نظمیں عورتوں کی بے بسی۔ بے چارگی کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ میرا بچپن عذرا عباس کی خود نشت ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے بچپن کی یادوں کو یکجا کیا ہے۔ خود نوشت کا اسلوب سادہ اور سلیس ہے۔ اس خود نوشت میں ایسی لڑکی کے حالات قلم بند ہیں جو آزادانہ طور پر زندگی بسر کرتی ہے۔ اپنی جن شرارتوں کا وہ ذکر کرتی ہیں۔ ان میں سے ان کی معصومیت جھلکتی ہے۔ اپنے بچپن کے گھر کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتی ہیں۔ ایک برآمدہ نما کمرا جہاں ان کی والدہ آگ جلا کر انہیں کھانا بنا کر دیتی ہیں۔ بالکونی جہاں وہ آتے جاتے پرندوں سے معصومانہ فرمائشیں کرتی ہیں۔ گھر کی سیڑھیاں جن پر انہیں آنا جانا تو یاد نہیں مگر وہ ان کے ذہن میں ایک تصویر کی طرح نقش ہیں۔ وہ اپنے بچپن کی شرارتوں کے واقعات بھی بیان کرتی ہیں۔ جن سے ایک شرارتی بچے کی تصویر جھلکتی ہے۔ اپنے دادا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

دادا ابا جو مجھے یاد ہیں۔ ہر وقت میرے پیچھے پڑے رہتے تھے۔۔۔۔۔جب میں ان کے سامنے گرد و غبار سے بھرے پاؤں لے کر کھڑی ہوتی تو دادا ابا کا چہرہ اور سرخ ہو جاتا۔ مردی تو باز نہیں آئے

گی۔ میرے سارے بہن بھائی مجھے یاد نہیں کبھی ننگے پیر رہنے پر دادا کی چھڑی سے پٹے ہوں۔ دادا کی اور میری جنگ جاری رہتی۔ [۲۱]

عذرا اپنے بچپن کی چھوٹی چھوٹی یادوں کو ایسے خوبصورت پیرائے میں بیان کرتی ہیں کہ وہ گلیاں اور راستے ایک فلم کی طرح آنکھوں نے گرد گھومنے لگتے ہیں۔ عذرا کا بار بار سکول کے بدلنے کا قصہ اور اپنی والدہ سے پٹنے اور ان کے کوسنے جو وہ عذرا کو ان کی شرارتوں سے تنگ آکر دیتی دلچسپ انداز میں بیان کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ گلیوں سے بیر ، ٹوٹی ہوئی چوڑیاں اور کچے گھروں کی دیواروں سے سیپیاں چننے کے دلچسپ واقعات قاری کو اپنے طرف کھینچے رکھتے ہیں۔ بچپن میں بہن بھائی کی تفریق پر ان کا ردعمل دلچسپ ہے کہ وہ اپنی والدہ سے کس طرح سے بحث کرتی ہیں اور بھائیوں کے دودھ سے بھرے پیالوں کو پاؤں کی ٹھوکروں سے گرا کر بھاگ جاتی ہیں۔

مجھے یاد آرہا ہے اس دن سے پہلے میں ہمیشہ کڑھتی جاتی تھی اور چائے پیتی جاتی تھی۔ لیکن اس دن مجھے جانے کیا ہو گیا۔ اماں نے جیسے ہی دودھ کے پیالے میرے بھائیوں کے سامنے رکھے، میں کھڑی ہو گئی اور ایک ہی لات سے دونوں کے پیالے لڑھکا دیے۔

"روز دودھ پیتے ہو!" میں شاید چیخی بھی تھی۔ سب ہکا بکا مجھے دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ کوئی حرکت کرتا، میں اماں کے کوسنے کی آوازوں کے درمیان اپنا بستہ اٹھا کر دروازے سے باہر بھاگ گئی۔ [۲۲]

عذرا کی اپنی ماں سے زیادہ قربت باپ سے تھی۔ جب بھی ان کے والد کہیں جاتے وہ ان کی تصویر لے کر گھر کے کونوں میں چھپ کر روتی تھیں۔ اور ان کی واپسی کے انتظار میں رات بھر جاگتی رہتی تھیں۔ عذرا ایک حساس طبیعت کی مالک بچی تھی جو انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں کو بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ وہ اس دور کی معاشرت کو بھی بیان کرتی ہیں۔ محرم کے ماتمی جلوس اور ان گلیوں کے مناظر جن میں وہ رات دیر گئے تک کھیلتی تھیں۔ عید ، بازاروں کی رونقیں سب بیان کرتی ہیں۔

اپنے والد کی غیر موجودگی میں ایک ذمہ دار بیٹی کا کردار بھی نبھاتی ہیں۔ اتنی چھوٹی عمر میں اپنی ماں کے چہرے پر پریشانی کی وجہ کو پڑھ لینے کا فن انہیں اچھی طرح آتا تھا۔ وہ ایک شرارتی بچہ ہونے کے ساتھ ساتھ حساس طبیعت کی مالک بچپن ہی سے تھیں۔ اور چھوٹی سی چھوٹی چیز کو محسوس کرتی تھیں۔ انہوں نے نوجوان لڑکیوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے ایسے سوالات کو بھی بیان کیا جن کا جواب دینا والدین مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی ماں باپ کی روک ٹوک ، پابندیاں اور اوڑھنی نہ اوڑھنے پر سرزنش وغیرہ کے بارے میں بھی اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ اور اپنے دل کی بھڑاس اس طرح سے نکالی کہ گھر کے سارے دوپٹے کوڑا دان میں پھینک دیئے۔ وہ لکھتی ہیں کہ :

اب میرا باپ، میرے بھائی مجھے اس طرح دیکھتے جیسے کسی قیمتی چیز کی رکھوالی کی جاتی ہو اور اسے بار بار دیکھنا پڑتا ہو۔ میں اکثر ان کی آوازوں کی زد میں ہوتی۔ "باہر کیوں جارہی ہو؟ بال باندھو۔ کود کیوں رہی ہو؟۔۔۔۔ میرا باہر جانا آہستہ آہستہ ختم ہورہا تھا۔[۲۳]

وہ لڑکا لڑکی کے فرق کو سمجھنے سے قاصر تھیں اور اس فرق کو کسی صورت بھی تسلیم کرنے کو راضی نہیں تھیں۔ عذرا عباس نے ایک متوسط گھرانے کی لڑکی کی زندگی کے حالات و واقعات اتنی خوبصورتی سے بیان کیے ہیں کہ قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ عذرا عباس نے اپنی ذات سے منسلک جن واقعات کا ذکر کیا ہے وہ معاشرے کی ہر عورت کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔

نوائے زندگی از ساجدہ زیدی:

ساجدہ زیدی میرٹھ کے اعلیٰ، مہذب، روشن خیال خاندان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والدین کی ازدواجی زندگی بڑی خوشگوار اور قابل رشک تھی۔ مگر بہت چھوٹی عمر میں ہی ساجدہ کے سر سے والد کا سایہ اٹھ گیا۔ اور ان کے والد کی وفات کے بعد ان کے تایا نے ان کی جائداد پر قبضہ کر لیا۔ ساجدہ اور ان کی پانچ بہنوں کی پرورش ننہال میں ہوئی۔ ساجدہ کی شادی قیصر حسین زیدی سے ہوئی جو کہ مسلم یونیورسٹی میں لیکچرار تھے۔ ساجدہ خود بھی بطور پروفیسر مسلم یونی ورسٹی میں اپنی خدمات سرانجام دیتی رہیں۔ ساجدہ ایک حساس، روشن خیال اور ذہین خاتون تھیں۔ گھر کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے تدریس کے شعبے اور تخلیقی و تصنیفی سرگرمیوں کو بھی فعال رکھا۔ انہوں نے اردو اور انگریزی میں بہت سی تصانیف لکھی ہیں۔ ساجدہ نے اپنی اس خودنوشت نوائے زندگی میں اپنی پیدائش، بچپن، والدین اور خاندان سے متعلق اہم باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی تعلیم، بچپن کی شرارتیں، سیر و تفریح، کھیل کود، اپنے مشغلوں اور والدین کی محبت و شفقت، رسم و رواج، تہذیب و تمدن کو بھی بیان کیا ہے۔ ساجدہ بچپن ہی سے حساس طبیعت کی مالک تھیں۔ انسانیت کا درد انہیں بے چین رکھتا تھا۔ ساجدہ اپنے بچپن کا ایک واقعہ لکھتی ہیں۔ ساجدہ اپنی ایک چچی جو کافی خوبصورت تھیں مگر ہمیشہ سفید لباس پہنتی تھیں ایک دن ساجدہ نے بیلے کے پھولوں کا گجرا بنا کر انہیں سجانا شروع کر دیا گھر کے سبھی افراد خصوصاً ان کی تائی نے انہیں ٹوکا کی یہ پھول نہیں پہن سکتیں۔ یہ بیوہ ہیں۔

میرے دل پر ایک دھکا سا لگا۔ بیوہ کا مطلب واضح ہوا دل میں درد و کسک کے ساتھ بغاوت کے جذبات بھی پیدا ہوئے۔ میرا دل چاہا میں تائی سے کہوں کہ آپ ان سے جلتی ہیں۔ مگر میں نے صرف اتنا کہا میں چچی ممانی کو پھول ضرور پہناؤں گی۔ پھر پتہ نہیں کیسے مجھے سمجھایا گیا۔ مگر میں نے دیکھا چچی ممانی کی غلافی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹپک رہے تھے۔ انھوں نے مجھے لپٹا

لیا۔ دل پر رسم ورواج کی سفاکی کا ضرور اثر رہا ہوگا۔ تب ہی تو یہ واقعہ آج تک یاد ہے۔ ان کی نرم آغوش میں راحت تھی۔ [۲۴]

ان کے والد کی وفات کی بعد ان کے تایا نے ان کے والد کی جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ اور ان کی والدہ بے سرو سامانی کی حالت میں اپنی پانچ بیٹیوں کے ہمراہ اپنے میکے آ گئیں۔ اور ماموں کے گھر میں ایک کمرہ ملا جس میں کچن باتھ روم بھی تھا۔ ساجدہ نے اپنے جذبات واحساسات، ماموں ممانی کے برتاؤ، گھر کے ماحول اور ان کے بچوں وغیرہ کی تفصیل بیان کی ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد پانی پت میں اپنے نانا کے ایک مکان میں رہنے لگیں۔ ساجدہ آٹھویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد علی گڑھ چلی گئیں۔ انہوں نے علی گڑھ کے تہذیب وتمدن کو، اپنے اساتذہ کی شخصیت، عادات و اطوار کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ وہ اپنی اعلیٰ تعلیم میں حائل رکاوٹوں کو بھی بیان کرتی ہیں۔ وہ اپنے ہاسٹل کے خرچ کے بارے میں لکھتی ہیں۔

> ہم بہنیں جز رسی سے کام چلاتے رہے۔ جب سب لڑکیاں پھل خرید کر کھاتیں، تو ہم مونگ پھلیوں ہی سے کام چلا لیتے۔ دو آنے روز میں ہمارا خرچ چل جاتا۔ ہمیں وہی اچھی لگنے لگیں۔ غریبوں اور قناعت پسندوں کی پسند بھی اپنی نفسیات ہوتی ہے۔ [۲۵]

ساجدہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ مگر پانچ بہنوں کی ماں نے بیٹیوں کی شادیوں کا بوجھ بھی اتارنا تھا۔ ساجدہ کی شادی قیصر زیدی سے سترہ سال کی عمر میں ہوئی۔ ساجدہ کی شادی کے کچھ عرصے کے بعد ہی آزادی کے فسادات شروع ہو گئے۔ ساجدہ نے آزادی کے دنوں کے حالات بھی بیان کیے اور کیسے انہوں نے اپنے خاندان کی اور اپنی جان بچائی۔ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں، ظلم و جبر اور ان کی تباہی کی سازشوں کے بارے میں بھی لکھا۔

انھوں نے اپنے پہلے بچے کی پیدائش، ممتا کے جذبات وتجربات کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا۔

> بہر حال سلمان کی آمد کے بعد میرا کچھ ایسا حال تھا کہ میری آتما اور پرم آتما ایک نقطے پر مرکوز تھے۔ میرے آنگن میں معصوم سی روشنی تھی۔ یہ روحانی روشنی ہوتی ہے۔ اس "خالص مسرت" میں کچھ کچھ عبادت کا کیف شامل ہوتا ہے۔ یہ خالص الوہی مسرت عورت کو دنیا کی اور کسی شے میں حاصل نہیں ہوتی۔ [۲۶]

ایک ذمہ دار ماں، بیٹی اور بہن کی حیثیت سے انہیں جن جن مشکلات سے گزرنا پڑا اس کا ذکر بھی کرتی ہیں اور ان تمام مشکلات کو تنہا جھیلنے میں انھوں کن کن چیزوں کا سامنا کرنا پڑا وہ بیان کرتی ہیں۔ اور اپنی بہنوں کی قید اور میکے گھر سے جڑی تمام الجھنوں میں اپنے شوہر کی بے اعتنائی کا ذکر بھی کرتی ہیں۔ ساجدہ ایک انسانیت پرست خاتون تھیں انہوں

نے اپنے ذہنی طلاطم کے ساتھ اپنی تخلیقی سر گرمیوں میں مگن رہیں۔ ساجدہ نے بنا کسی مفاد کے اپنے سبھی رشتوں کے لیے وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتی تھیں۔ ساجدہ نے مختلف مغربی ممالک کی سیر بھی کی۔ انہوں نے ان ممالک کی فضا، ماحول، تہذیب و تمدن کو بیان کیا۔ ساجدہ نے اپنے تعلیمی سفر، اپنی علمی و ادبی سر گرمیوں اور اپنی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنی خود نوشت میں بیان کیا۔ ان کی خود نوشت ایک ایسی عورت کی تصویر پیش کرتی ہے جس نے اپنے حالات اور پریشانیوں کو پس پشت ڈال کر اپنے سے جڑے تمام رشتوں کی ذمہ داریوں کو بھی باخوبی نبھایا اور اپنے خواب بھی پورے کیے۔ اور اپنے جیسی بہت سی عورتوں کی مدد بھی کی۔ ساجدہ زیدی ایک مضبوط کردار کی خاتون تھیں۔ جنہوں نے نا صرف گھر کر ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے نبھایا بلکہ اپنے شعبے کے ساتھ بھی مکمل انصاف کیا۔ اور ان کی تمام تر کامیابیاں ان کی اپنی ذاتی کوششوں کی مرحون منت تھیں۔

شورش دوراں اہم ساتھ تھے از حمیدہ سالم:

حمیدہ سالم قصبہ رودلی ضلع بارہ بنکی کے ایک زمین دار گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ حمیدہ کا تعلق براہ راست ادب سے نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے دور کے ادبی ماحول کو قریب سے دیکھا تھا۔ اور اس دور کے احوال اپنی خود نوشت میں قلم بند کیے۔ یہ خود نوشت کسی ادیب و فنکار کی آپ بیتی نہیں ہے۔ یہ خود نوشت ایک عام گھریلو اور درس و تدریس سے وابستہ خاتون کی ہے۔ ان کی خود نوشت سے ایک عام عورت کی سوچ اور اس دور کی عورتوں کی نفسیات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ قصبہ رودلی کی زندگی، وہاں کے عیش و آرام، وہاں کے لوگوں کی زندگی کے معمولات، رسم و رواج، شادی بیاہ کے موقعوں کی رونقیں اور مہمان داریاں اور ہندوؤں کے تیوہاروں کے مناظر بھی خوبصورت انداز میں بیان کیے ہیں۔ حمیدہ اپنے بچپن اور آج کی سماجی اقدار و روایات کے متعلق لکھتی ہیں

> ہم کو اپنے بچپن میں محرم اور دیوالی بھی عید بقر عید ہی کی طرح دل چسپ تہوار لگتا تھا اور ہم اس کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ محرم اب زیادہ تر شیعہ طبقہ سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ اور دیوالی تو بہ تو وہ تو ہے ہی غیر مسلموں کا تہوار اس سے ہمارے بچوں کا کیا واسطہ اگر آپ چند موم بتیاں جلا لیں تو کافر وہ بات دوسری ہے کہ آپ کے بچے نت نئے بازار میں آئے ہوئے پٹاخوں کے شور سے پڑوسی کی نیند حرام کرتے رہیں۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن دیوالی منانا گناہ قرار دے دیا گیا ہے۔ ہم اپنے بچپن میں ثواب و گناہ کی اس قسم کی تعلیم سے ناواقف تھے۔ تعلیم بڑھی انسان کی تجربات میں اضافہ ہوا۔ جغرافیائی فاصلوں کے عبور میں زمین و آسمان کا فرق پڑا۔ لیکن عقائد کی بنا پر دور کرنے والی دیواریں بلند سے بلند تر ہوتی گئیں۔ [۲۷]

شورش دوراں کے بعد انہوں نے ہم ساتھ تھے کے نام سے دوسری آپ بیتی لکھی جو جسے شورش

دوراں کا اضافہ کہا جا سکتا ہے۔ حمیدہ نے اپنے بچپ ن کی یادوں اور زمین داری خاتمے کے وجوہات، لکھنؤ کی زندگی ،طرز معاشرت وغیرہ کے بارے میں اہم معلومات پیش کی ہیں۔ حمیدہ کی شادی ان کے کلاس فیلو ابو سالم سے ہوئی۔ ان کے شوہر ایک مہمان نواز انسان تھے اور اکثر و بیشتر مہمانوں کا تانتا باندھے رکھتے تھے۔ ان کی خود نوشت جاگیر دارانہ نظام اور ملک کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی اقدار کے عروج وزوال کے اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ انہوں نے جاگیر داروں کی عیش پرستی اور مزدور طبقے کے استحصال کو دکھ کے ساتھ بیان کیا۔ حمیدہ کے دور تک تعلیم نسواں کا رجحان عام ہو چکا تھا اور خواتین میں سیاسی و سماجی بیداری کسی حد تک پیدا ہو چکی تھی۔ ان کی بہن صفیہ اپنے والد کی طرح رودلی کی پہلی گریجویٹ تھیں۔ گھر کا مذہبی ماحول ہونے کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم پر بھی خاصی توجہ دی گئی۔ ان کے والد نے کئی ملازمتیں کیں۔ اپنے والد کے بارے میں وہ لکھتی ہیں کہ انہوں نے ایکسائز ڈپارٹمنٹ کی جاب اس لیے چھوڑی کہ وہاں شراب کو چکھ کر یہ دیکھنا پڑتا تھا کہ بوتلوں میں دیسی شراب تو نہیں بھری گئی۔ پھر افسوس کے انداز میں لکھتی ہیں کہ کب سوچا ہوگا کہ ان کی لاڈلی اولادیں اس زہر کا شکار بنیں گی۔[۲۸]

اپنے بھائیوں کی تعریف میں وہ بتاتی ہیں کہ بھائیوں نے ہمیشہ بہنوں کا ساتھ دیا۔ بہنوں کی تعلیم سے لے کر ان کی شادیوں تک ان کی حمایت کی اور انہی کی خواہشات کو مد نظر رکھا۔ ایک طرف وہ اپنے بھائی پر فخر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اگلی زندگی کی تباہی و بربادی پر افسوس بھی کرتی ہیں۔ حمیدہ نے اپنے بھائی کی شخصیت اور عروج وزوال کا تذکرہ کچھ یوں کیا ہے۔

> لڑکیاں تکیے کے نیچے ان کی تصویر چھپا کر رکھتی تھیں۔ ان کے نام کی پرچیاں نکالتی تھیں۔ دیواریں گر گئیں، پابندیاں ہٹ گئیں۔ پروانے دور ہی دور سے تماشائی بنے رہے۔ شمع قطرہ قطرہ پگھلتی گئی۔ گھلتی گئی آخر کار بجھ گئی، کیا کمی تھی میرے اس بھائی میں۔ چھریرا بدن، لمبا قد، ستواں ناک، پتلے ہونٹ، چھوٹا دہن، چمک دار آنکھیں، سنہرا رنگ، طبیعت میں قناعت و شرافت، لہجے میں ٹھہراؤ اور دھیما پن۔ گفتگو میں مٹھاس اور ایک ایسی بذلہ سنجی جس کی مثال مشکل۔ برتاؤ میں خلوص و محبت۔ لیکن شاعری کے ساتھ ساتھ شراب کی عادت ہو اور جیب خالی ہو۔ ایسے میں کس پروانے کی ہمت تھی قریب آکر رفاقت کا ہاتھ بڑھانے کی۔ ہمت کی بھی تو راہ میں اس کے بہی خواہوں کے مشورے حائل ہوئے۔ غرض کہ در در سے ماں بہنوں کے ہاتھ خالی ہی واپس ہوئے اور میرے بھائی کی زندگی تنہا گزری۔ عورت کا ایک اچھوتا اور خوبصورت تصور ان کے اشعار ہی تک محدود رہا۔ ان کے لیے اصلیت کا روپ نہ ڈھال سکا۔[۲۹]

اپنے بھائی اسرار الحق مجاز اور بہن صفیہ اختر کی موت نے انہیں گہرے صدمے سے دوچار کر دیا۔ اور انہوں نے اپنے بہن کے بچوں کی تربیت کی ذمہ داری بھی لے لی۔ حمیدہ نے بحیثیت بیٹی، بیوی، ماں، خالہ اور بہو اپنی زمہ

داریاں ایک مثالی عورت کی طرح نبھائیں۔ان کی اس خود نوشت میں رودلی کے تمام زمیندار گھرانوں کی زندگی کا پتہ چلتاہے۔انہوں نے اپنے شوہر کے ساتھ جن جن ممالک کی سیر کی ان کا احوال بھی خوبصورتی سے لکھاہے۔اور دوران سفر پیش آنے والے تجربات ومشاہدات اور اہم مقامات کی تاریخی تہذیبی، جغرافیائی، سیاسی احوال وکوائف کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ پیش کیاہے۔

پردے سے پارلیمنٹ تک ازشائستہ سہروردی اکرام اللہ:

شائستہ اکرام اللہ ۱۹۱۵ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئیں۔انہوں نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی وہ کوئی معمولی گھرانہ نہیں تھا بلکہ بنگال کے امراء کا خاندان تھا۔ بیسویں صدی میں برصغیر میں جن خواتین نے سماجی اور عملی سیاست میں حصہ لیا اور تاریخ میں اپنا نام پیدا کیا،ان میں ایک نمایاں نام بیگم شائستہ سہروردی اکرام اللہ کا ہے۔ جنہوں نے ایک قدامت پرست معزز گھرانے میں آنکھ کھولی۔ جہاں عورتوں کے لیے ہر آسائش موجود تھی مگر جدید تہذیب اور تعلیم کے دروازے ان کے لیے بند تھے۔گھر میں رہنا اور پردے کی پابندی کرنا ان کی معاشرتی زندگی کا حصہ تھا۔ مگر شائستہ اکرام اللہ وہ خوش نصیب عورت تھیں جنہوں نے اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ جدید انگریزی تعلیم بھی حاصل کی۔ سماجی کاموں میں پیش پیش رہیں۔ایک پڑھے لکھے گھرانے میں شادی ہونے سے ان کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو جلا ملی۔سیاسی زندگی میں بھی انہوں نے خوب نام روشن کیا۔پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کی ممبر بنیں۔یو این او میں اپنے ملک کی بھرپور نمائندگی کی۔اور مراکش میں سفیر پاکستان کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات سرانجام دیں۔ان کی خود نوشت پردے سے پارلیمنٹ تک محض ان کی زندگی کی داستان نہیں ہے بلکہ اس کتاب میں غیر منقسم ہندوستان، تحریک آزادی اور تقسیم کے بعد پاکستان کے قیام اور سیاسی مدوجزر کی تاریخ رقم ہے۔یہ خودنوشت بیسویں صدی میں برصغیر کے حوالے سے اہم دستاویز ہے۔ اس خودنوشت میں انہوں نے اپنے آباؤاجداد کے بارے میں تفصیلا"معلومات فراہم کیں۔

ان آپ بیتیوں کے مطالعے سے پتہ چلتاہے کہ عورت نے اپنا انفرادی تشخص قائم کرنے کے لیے بہت جدوجہد کی۔انہوں نے اپنی زندگیوں کے تجربات اور مشاہدات سے دوسری خواتین کو یہ حوصلہ دیا کہ زندگی میں کوئی بھی مقام آسانی سے نہیں ملتا بلکہ اس کے لیے محنت اور مسلسل کوشش درکار ہوتی ہے۔زمانے کی سختیاں جھیل کر،اس معاشرے میں جینا مشکل ضرور سہی ناممکن نہیں ہے۔خودنوشت نگاری عورتوں میں بیداری، خوداعتمادی اور اخلاقی جرات کو پیدا کرنے کا سبب بنی۔اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو خواتین خودنوشت نگاروں نے اپنی اپنی زندگی کے حوالے سے سماج کے اس رخ کو بے نقاب کیا جو اب تک ظہور میں نہیں آیا تھا۔

حوالہ جات

۱۔ نواب سلطان جہاں بیگم،خطبات سلطانی(بھوپال:۱۹۱۳ء)،ص۲۳۵۔

۲۔ انیس قدوائی،آزادی کی چھاؤں میں(نئی دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ،۱۹۸۰ء)،ص۲۰۔

۳۔ ایضاً ،ص۱۷۹۔

۴۔ ایضاً ،ص۳۳۳۔

۵۔ ایضاً ،ص۳۴۴۔

۶۔ صالحہ عابد حسین،سلسلہ روز وشب(نئی دہلی: مکتبہ جامعہ،۱۹۸۴ء)،ص۴۹۔

۷۔ ایضاً ،ص۸۸۔

۸۔ ایضاً،ص۱۷۴۔

۹۔ سعیدہ بانواحمد،ڈگر سے ہٹ کر(نئی دہلی: سجاد پبلشنگ ہاؤس،۱۹۹۶ء)،ص۳۴۔

۱۰۔ ایضاً،ص۳۴۔

۱۱۔ ایضاً،ص۵۰،۵۶۔

۱۲۔ وہاج الدین علوی،اردو میں خود نوشت (فن اور تجزیہ)(نئی دہلی:مکتبہ جامعہ،۱۹۸۹ء)، ص۷۸۔

۱۳۔ نفیس بانو شمع۔جنت سے نکالی ہوئی حوا(نئی دہلی:آبشار پبلی کیشنز،۱۹۹۸ء)،ص۱۱۳۔

۱۴۔ عصمت چغتائی،کاغذی ہے پیرہن(نئی دہلی: پبلی کیشنز،ڈویژن پٹیالہ،۱۹۹۴ء)،ص۲۰۔

۱۵۔ ایضاً،ص۲۶۔

۱۶۔ امرتا پریتم،رسیدی ٹکٹ(لاہور:مکتبہ اردوادب،۲۰۰۵ء)،ص۱۱۔

۱۷۔ ایضاً،ص۱۱۔

۱۸۔ ایضاً ،ص۲۴۔

۱۹۔ ایضاً،ص۳۵۔

۲۰۔ ایضاً،ص۳۰۔

۲۱۔ عذرا عباس،میرا بچپن(طبع دوم)(کراچی:ایجوکیشنل پریس،۲۰۰۱ء)،ص۱۴۔

۲۲۔ ایضاً،ص۲۱۔

۲۳۔ ایضاً، ص۶۱۔

۲۴۔ ساجدہ زیدی، نوائے زندگی (دہلی: اردو اکادمی، ۲۰۱۲ء)، ص۴۱۔

۲۵۔ ایضاً، ص۸۳۔

۲۶۔ ایضاً، ص۱۵۷۔

۲۷۔ حمیدہ سالم، شورش دوراں اور ہم ساتھ تھے (دہلی: ادب پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)، ص۳۷۳۔

۲۸۔ ایضاً، ص۸۴۔

۲۹۔ ایضاً، ص۱۰۶۔

باب سوم:

اردو شاعرات کی آپ بیتیوں میں معروضی رویوں اور انفرادی تشخص کے اظہار کا مطالعہ

باب سوم:

اردو شاعرات کی آپ بیتیوں میں معروضی رویوں اور انفرادی تشخص کے اظہار کا مطالعہ

ہر معاشرے نے اپنے زمینی حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے صنفی معیارات طے کر رکھے ہوتے ہیں۔ان معیارات کا تعلق اس معاشرے کے ذہنی اور عصری شعور سے ہوتا ہے۔ مشرقی معاشرت کی بات کی جائے تو اس میں مرد کا معیار جارحیت، حاکمیت اور ملکیت سے عبارت ہے لیکن عورت کے لیے کوئی معیار زندگی نہیں طے کیا گیا۔ حوّا کی بیٹیوں کا مقام و مرتبہ ہمارا سماج اور معاشرہ آج تک متعین نہیں کر سکا۔ کبھی اس کے وجود سے تصویر کائنات میں رنگ بھرے جاتے ہیں تو کبھی اسے ناقص العقل اور ٹیڑھی پسلی کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔کچھ لوگوں کا خیال تو یہ ہے کہ اگر عورت نہ ہوتی تو ہم جنت میں ہوتے۔ عورت کا وجود دنیا میں فتنہ و فساد، قتل و غارت کا سرچشمہ قرار دیا جاتا ہے۔ عورت کے معاملے میں کشمکش کا ماحول اب بھی قائم ہے۔

گزشتہ کئی صدیوں سے ہمارے سماج کی عورت اپنا مقام و مرتبہ حاصل کرنے کی جنگ لڑ رہی ہے۔ جس کا ایک واضح ثبوت خواتین مصنفین کی تحریروں میں ملتا ہے۔ خواتین نے اپنی تخلیقات کو دنیا کے سامنے لا کر باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ان کے جذبات و احساسات اور افکار کو بیڑیاں نہیں پہنائی جا سکتیں۔ صدیوں سے عورت ذہنی اور جسمانی سزا کاٹ رہی ہے اور یہ معاشرہ ابتداء سے لے کر آج تک اس پر اپنے فرمان صادر کرنے کی نا صرف جد وجہد کر رہا ہے بلکہ بہت حد تک اس میں کامیاب بھی ہے۔

اردو کی نثری اصناف میں خودنوشت سوانح عمری کی افادیت اور اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔اس صنف میں زیادہ تر ادبی کاوشیں مرد مصنفین کی ہیں۔چند خواتین نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے ان میں سے دو اہم نام ادا جعفری اور کشور ناہید کے بھی ہیں۔ادا جعفری کی آپ بیتی جو رہی سو بے خبری رہی اور کشور ناہید کی آپ بیتی بری عورت کی کتھا کو اردو آپ بیتی کی روایت میں اہم خیال کیا جاتا ہے۔ادا جعفری نے ایک گھریلو، روایتی اور پردہ دار خاتون ہونے کے باوجود معاشرے کے معروضی اور سماجی رویوں کو پرکھا اور اپنی آپ بیتی میں انہیں اجاگر کیا۔اس کے علاوہ روز مرہ زندگی کی چہل پہل، جاگیر دارانہ طبقے کی عیاشیوں، لاپروائیوں اور سماجی روایات و اقدار کو بھی بیان کیا۔ سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں:

جو رہی سو بے خبری رہی کو ایک نہایت کامیاب خود نوشت اس لیے بھی کہا جا سکتا ہے کہ ادا نے اپنی زندگی کے ہر گوشے کو بے نقاب کرنے کے باوجود صرف اپنی ذات کو ہی توجہ کا مرکز نہیں بنایا بلکہ اپنے عہد و ماحول، اعزہ و احباب سبھی کے ساتھ انصاف کیا ہے کسی کو نظر انداز نہیں کیا۔ یوں تو یہ ادا جعفری کے سفر زندگی کی روداد ہے مگر ایک مکمل عہد، ایک خاص زمانے کی تہذیب، طرز فکر، طریق معاشرت، اس دور کی نامور شخصیات، کیا ہے جو ان کے پونے چار سو صفحات میں سمٹ آیا۔[1]

یہ مقالہ خواتین شاعرات کی آپ بیتیوں کے تجزیاتی مطالعے کا احاطہ کرتا ہے ان خواتین کی تحریروں میں ان کی شخصیت، نظریات اور زندگی کے لائحہ عمل کو جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ آپ بیتیاں دوسری خواتین کے لیے مشعل راہ ہیں۔ انہیں زندگی میں جہد پیہم اور خودی کی شناخت کا پیغام دیتی ہیں۔ ادا جعفری اور کشور ناہید کی زندگیاں چار دیواری میں بسر نہیں ہوئیں بلکہ انھوں نے معاشرے کے تمام داخلی و خارجی نظریات کا سامنا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی خود نوشتوں میں اپنی ذات کے ادراک سے لے کر اپنے عہد کے ادراک تک کی سعی کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے معاشرے کے معروضی اور سماجی رویوں کو جھیلتے ہوئے اپنے انفرادی تشخص کو نا صرف پہچانا بلکہ معاشرے میں اپنا مقام و مرتبہ بھی واضح کیا۔ انھوں نے معاشرتی اقدار کی شکست و ریخت کو محسوس کیا اور اپنے ذاتی دکھوں کی گٹھڑی اٹھائے اجتماعی زندگی کے کرب میں مکمل طور پر شریک رہیں۔ ان آپ بیتیوں میں ان کے معاشرتی نقطہ نظر، افکار اور زندگی و ادب کے متعلق آگاہی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ زمانے کی تلخیوں کو جھیلتے ہوئے، سماجی رویوں کا زہر پیتے ہوئے عورت نے اپنا انفرادی تشخص کس طرح پہچانا۔ عورت کے بارے میں پائے جانے والے معروضی رویوں نے اس کی ذات کو کیسے متاثر کیا؟ ان سب کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ان آپ بیتیوں میں پیش کردہ اس عہد کے رسم و رواج اور تہذیب و معاشرت کا مطالعہ بھی کیا جائے گا۔

جو رہی سو بے خبری رہی میں معروضی رویوں کا مطالعہ:

ہمارا معاشرہ عورت کو ایک شے سمجھتا ہے۔ جس کی اپنی کوئی سوچ نہیں۔ مرد نے عورت کی حیثیت کو کبھی تسلیم نہیں کیا بلکہ اپنے فیصلوں کو عورت پر مسلط کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ ہر چھوٹے بڑے فیصلے کی لیے عورت مرد کی محتاج ہے۔ عورت ہمیشہ سے ہی اس کی ہر رائے کے آگے سر تسلیم خم کرتی نظر آتی ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی پوری زندگی اسی گھٹن زدہ ماحول میں گزاری ہوتی ہے جہاں دوسرے اس کی زندگی کے فیصلے اس پر صادر کرتے ہیں اور اس کا اپنا وجود بے معنی ہوتا ہے اور اسے اپنی زندگی کے فیصلوں میں بولنے کا بھی کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ذات سے متعلق کیے گئے ہر فیصلے کو خاموشی سے تسلیم کر لیتی ہے۔

ایک جدید نسائی نقاد Bell Hooks نے کہا ہے کہ:

> عورت یقیناً "ایک وجود یعنی Subject ہے کوئی "شے" یعنی Object نہیں ہے۔اور وجود کو شے پر اسی بنیاد پر برتری حاصل ہوتی ہے کہ وجود اپنی ذاتی سچائیوں کو خود بیان کرنے کی اہلیت رکھتا ہے جبکہ اشیاء محتاج اور بے زبان ہوتی ہیں اور ان کی حقیقت کوئی اور بیان کرتا ہے۔اور اس ضمن میں یہ اختیار بھی رکھتا ہے کہ وہ اس کی اہمیت کا تعین اپنی مرضی اور منشاء سے کرے۔[۲]

ادا جعفری نے بھی اپنی اس آپ بیتی میں ان تمام عوامل کی نشاندہی کی ہے جس میں عورت مرد کے ہر فیصلے کو مانتی ہے۔اسے اپنی ذات پر برتری دیتی ہے۔مرد کی سوچ کو اپنی سوچ پر فوقیت دیتی ہے۔"مرد تھے جن کی جنبش ابرو پر زندگی بھر کی خوشیوں یا محرومیوں کے فیصلے ہوتے تھے اور بیبیاں تھیں جو ان فیصلوں کو دین ایمان کے احکام کا درجہ دیتی تھی۔[۳]

مرد نے عورت کی زندگی کے ہر فیصلے کو ہمیشہ اپنی دسترس میں رکھا ہے۔مرد اور عورت کی یہ تخصیص عموما گھروں کے ماحول سے ہی شروع ہوتی ہے۔اگر بچہ زیادہ باتیں کرے تو اسے مذاق کے انداز میں یہ کہا جاتا ہے تم عورتوں کی طرح بہت بولتے ہو۔اسی طرح گھر میں کسی بھی معاملے میں رائے یا اجازت کی بات آئے تو یہ کہا جاتا ہے کہ عورت کیا فیصلہ کرے گی،اس سے کیا پوچھنا وغیرہ وغیرہ اس قسم کے فقرے تربیتی رویوں کی بنیاد بنتے ہیں۔مرد کو بچپن سے ہی ہر قسم کی آزادی دی جاتی ہے۔اسے بہن پر برتری دی جاتی ہے۔اس کے غصے کو اس کی مردانگی سمجھ کر اس کی ہر خواہش پوری کی جاتی ہے۔اگر کبھی کسی کھلونے پر بھی لڑائی ہو جائے تو بہن کو صبر اور برداشت کی تلقین کر کے کھلونا بیٹے کو دے دیا جاتا ہے۔ادا جعفری کہتی ہیں کہ:

> ہر دور میں مردوں کا دباؤ عورتوں پر اس قدر رہتا ہے کہ عورتوں کو اپنے حقوق کا علم ہی نہیں ہوتا اور نہ ہی عورت کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس سے آگہی حاصل کر سکے۔اگر کوئی اس ڈگر پر چلنا چاہے بھی تو اس کردار پر کئی قسم کے فتوے لگا دیے جاتے ہیں۔اسی لیے عورتیں مردوں کے طے کردہ فیصلوں کو حرف آخر مان کر آمین کہہ دیتی ہیں اور اپنی پوری زندگی ان فیصلوں کی بھینٹ چڑھتی رہتی ہیں ."مجھے یاد ہے بچپن میں میری سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ کبھی خاندان کے لڑکوں کی طرح میں بھی اس سڑک پر پیدل چلوں اور تقدیر کا فیصلہ یہ تھا کہ میں پوری دنیا گھوم لوں لیکن میرے قدم اس سڑک کو کبھی نہ چھو سکیں۔[۴]

ادا جعفری اپنی زندگی میں بہت سے شہروں اور ملکوں میں گئیں۔وہاں قیام کیا لیکن جو نظام اور طریقہ کار انہوں نے برصغیر میں دیکھا ویسا کہیں بھی نہیں تھا۔وہ اس سماج کے فرسودہ رویوں اور سوچ کا ذکر کرتی ہیں کہ لڑکیوں کو یہ حق نہیں دیا جاتا کہ وہ اپنی مرضی سے سوچیں اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں یا اپنی ہمجولیوں سے ملیں،

اٹھیں، بیٹھیں، آئیں، جائیں ان کی یہ آرزوئیں ان کے دل میں ہی دفن ہو جاتی ہیں کیونکہ اس کا حق ان سے چھین لیا جاتا ہے۔ گھروں میں ماؤں کا رویہ بھی لڑکیوں کے ساتھ سخت گیری اور لڑکوں کے ساتھ آزادی کا ہوتا ہے۔ لڑکی کو گھر میں رکھا جانا اور گھر میں ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھنا اپنا فرض سمجھا جاتا ہے۔ اگر لڑکیاں اپنی ہم جولیوں کے ساتھ باہر نکلیں، پکنک پر یا پھر بازار میں خرید و فروخت کے لیے جائیں تو بھوکی نظریں ان کا تعاقب اس قدر کرتی ہیں کہ وہ گھبرا جاتی ہیں اور ہر قسم کی تفریح ان کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔

یہ دنیا مرد کو انسان سمجھتی ہے اور عورت کو صرف بے جان شے اس سماج میں عورت کے ساتھ انصاف صرف اسی وقت ممکن ہو گا جب عورت کو بھی انسان سمجھا جائے گا اور اسے بھی انسان ہونے کی حیثیت سے علم حاصل کرنے اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کی پوری آزادی دی جائے گی۔ کیونکہ یہ ان کا بنیادی حق ہے اور کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان کے اختیارات کو ختم کر سکے۔ بنیادی حقوق نہ ملنے کی وجہ سے عورت ہمیشہ مردوں سے بہت پیچھے رہی ہے۔ پسماندہ طبقے کی عورت کی بات کی جائے جو اکثر پڑھی لکھی نہیں ہوتیں بلکہ زیادہ تر گھریلو ملازمہ کے طور پر کام کرتی ہیں۔ تاہم جب مہینے کے بعد اپنی تنخواہ لے کر گھر جاتی ہیں تو ان سے ان کی محنت کی کمائی چھین لی جاتی ہے۔ انہیں اتنا بھی حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے ان پیسوں کو خرچ کر سکیں۔ اگر وہ اس بے انصافی پر اپنی آواز بلند کرتی ہیں تو انہیں مار پیٹ کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ادا جعفری بھی اپنی ایک ایسی ہی ملازمہ کا ذکر کرتی ہیں۔

> وہ ہمیشہ لٹی پٹی صورت لئے دروازے سے داخل ہوتی کھلی آنکھ کے اوپر نیل ہوتا تو کبھی منہ سوجا ہوا کبھی ہاتھ پاؤں زخمی گھر میں سب کو معلوم ہو جاتا کہ شوہر نے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا ہے کیونکہ جو پیسہ اس نے کمایا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔[5]

ہمارے سماج نے مردوں کی بے جا حمایت کر کے انہیں زیادہ ہی برتری دے دی ہے۔ مرد عورت کو کمزور سمجھتے ہیں اور یہ بھی خیال کرتے ہیں عورت ان کے مقابلے میں کم عقل ہے اور انہیں اس چیز کا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق عورت کی شخصیت کو ڈھالیں اور عورت کی اپنی شناخت ختم کر دیں۔ عورت کو دوسروں کے کام آنے والی مشین سمجھا جاتا ہے۔ گھر کے کام کاج کے ذریعے عورت کی نسوانی حیثیت کو بنانے کا تصور مستحکم کیا جاتا ہے کہ وہ انہی کاموں کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اگر عورت مرد کا ہاتھ بٹانے یا بہتر حالات زندگی کے لیے نوکری کی غرض سے گھر سے باہر نکلتی ہے تو مرد سمجھتا ہے کہ اس کی تمام تر کمائی پر اسی کا حق ہے۔ ہمارے سماج میں مرد عورت کو اپنا غلام سمجھتا ہے۔ اس کی زندگی کے تمام تر اختیارات اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے اگر عورت اس کے خلاف آواز اٹھاتی بھی ہے تو مرد اپنی طاقت کے زور سے اس کی آواز کو دبا دیتا ہے۔

ادا جعفری کی یہ آپ بیتی ایک عام لڑکی کی زندگی کی کہانی ہے جس میں انہوں نے اپنے حالات زندگی اور ادبی شخصیات سے ملاقاتوں کا احوال بھی بیان کیے ہیں۔ انہوں نے شاعری کی طرح آپ بیتی میں بھی تانیثی فکر کا دامن نہیں چھوڑا اور جدھر خود کو یا کسی عورت کو صرف عورت ہونے کی وجہ سے ناانصافی کا سامنا کرنا پڑا اس کو نہ صرف قلمبند کیا بلکہ اس کے خلاف علم بغاوت بھی بلند کیا۔

اس آپ بیتی میں ایک جگہ ادا جعفری زندگی کے ابتدائی دنوں کا ذکر کرتے ہوئے عورتوں کے لیے معاشرے کے معروضی رویوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ٹونک والا پھاٹک کے اندر رہنے والے ایک طے شدہ ضابطہ حیات کے مطابق زندگی گزارتے تھے۔ جہاں روایت شکن قسم کے فیصلے مرد خود اپنے لئے نہیں کر سکتے تھے وہاں عورتوں کے لیے تو سانس لینے کے آداب تک مقرر تھے۔[6]

مردوں کی بات کی جائے تو اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ مرد بے باک، ذہین، مہذب اور فکری طور پر پختہ خواتین سے گھبراتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کی عورت پر دباؤ ڈالنا بہت مشکل ہے۔ سیمون دی بوار نے عورت کے بارے میں لکھا ہے:

> آج کی دنیا میں جبکہ لڑکی اپنا مستقبل خود بنا رہی ہے۔ کہیں وہ کھیلوں میں، کہیں ادب، سیاست اور سماجیات اور کہیں پیشہ ور شعبوں میں مہارت حاصل کر کے مرد کے حصار اور مجازیت کی سجدہ گیری سے آزاد ہو رہی ہے۔ مگر اب اسے اپنے جتنا بالغ، آزادی پسند اور مساوات کا خواہاں، مرد نہیں ملتا۔ جبکہ خاندان والے بھی اس کے ان رویوں کو صحت مند نظروں سے نہیں دیکھتے۔[7]

ہمارے معاشرے میں لڑکی کو تعلیم حاصل کروانا پیسے اور وقت کا زیاں سمجھا جاتا ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ بیاہ کر پرائے گھر چلی جائے گی دوسری وجہ لڑکی کا زیادہ پڑھ لکھ جانا بھی ان کے لیے خطرے کی ایک گھنٹی ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ پڑھ لکھ کر وہ اپنے حقوق سے آگاہ ہو جائے گی اور کسی بھی زیادتی کو چپ چاپ سہنے کی بجائے اس ظلم و زیادتی کے خلاف اپنی آواز کو ضرور بلند کرے گی۔ ادا جعفری عورتوں کی تعلیم کے حوالے سے ذکر کرتی ہیں کہ مرد کا جاگیر دارانہ رویہ عورتوں کی تعلیم کو ضروری ہی نہیں سمجھتا۔

> مدتوں برصغیر میں مرد کے پندار برتری نے عورت کو علم و آگہی کے ورثے کے قابل ہی نہیں سمجھا تھا۔ اور مدتوں عورت احساس محرومی سے بھی محروم رہی تھی اتنا تو میں جانتی ہوں کہ ٹونک والا پھاٹک کے اندر زمرد کا گلوبند ادراک حیات سے زیادہ قیمتی تھا۔ یوں بھی جاگیر داری نظام میں یہ صرف مرد کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ اپنی زیر نگیں مخلوق کو کس حد تک شرف دینا چاہتا ہے اور مرد کو عورت کے ذہن یا اس کے علم کی کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں تھی۔[8]

ادا جعفری نے اس اقتباس میں اس رویے کا اظہار کیا ہے جو برصغیر میں مرد کی طرف سے عورت کے لیے صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ وہ ہمیشہ سے عورت کو مرد کی غلام اور جاگیر سمجھتا آیا ہے اور علم جو ہر انسان پر فرض ہے اس میں بھی مرد کی مرضی کے بغیر عورت تعلیم حاصل کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ یہاں تک کہ عورت ان پابندیوں کی اس قدر عادی ہو چکی ہے کہ اس کو یہ قید محسوس ہی نہیں ہوتی اور نہ اس کے اندر کوئی احساس محرومی جنم لیتا تھا۔ اس کی زندگی اور سوچ محدود ہے۔ بصد مجبوری عورت نے یہ سب کچھ برداشت کرتی آرہی ہے۔ برصغیر کی عورت نے زندگی کی ہر محرومی کو اپنی اولاد کی خاطر جھیلا۔ ادا جعفری لکھتی ہیں:

> برصغیر میں اگلے زمانوں کی عورت نے اپنی تمام محرومیوں کا معاوضہ اتنا ہی چاہا کہ اس کی اگلی نسل کو سانس لینے کے لیے تھوڑی سی اور کھلی فضا میسر آجائے۔ بے شک اس کوشش میں وہ شاد کام رہی۔ عورت نے جینے کے لیے بڑا طویل سفر کیا ہے۔[9]

پھر آہستہ آہستہ وقت بدلتا گیا اور عورت باشعور ہوتی گئی۔ بعد ازاں اس نے اپنے علم اور قلم کے ذریعے اپنے احساسات کو زبان دی۔ اس نے قلم کے سہارے اپنے دکھوں کو شاعری اور نثر کی صورت میں بیان کیا۔ سلویا پہلی مغربی شاعرہ تھی جس نے پہلی بار کھل کر ایک باشعور مکمل عورت کے جذبات کو عورت کے نقطہ نظر سے پیش کیا ہے۔ سلویا کی شاعری اسی حقیقت کی آئینہ دار ہے۔

> خواتین کی شاعری میں نسائی زاویہ نگاہ کی جو تحریک چلی اسے نقطہ عروج تک یقیناً سلویا کی شاعری نے پہنچایا۔ اس نے عورت ہونے کے تمام سہانے اور ڈراؤنے مناظر دیکھے اور برتے تھے اور وہ ان کو بیان کرنے کی جرأت بھی رکھتی تھیں۔

ایک نظم میں کہتی ہے:

> کسی دیوتا نے میرے بالوں کو جڑوں تک گرفت میں لے کر مجھ پر قابو حاصل کر لیا اور میں صحرا میں کسی سنت سادھو کی طرح اس کے برقی شکنجے میں بھنتی رہی۔[10]

ادا جعفری اپنی آپ بیتی میں مغربی شاعرہ سلویا کے بارے میں بات کر رہی ہیں جس نے عورت کے ساتھ مردوں کے غیر مساویانہ سلوک کو بہت کھل کر بیان کیا ہے۔ طاقتور مرد عورت کو ہمیشہ اپنے ظلم و زیادتی کا نشانہ بناتے ہیں اور پھر اس کی بے بسی دیکھ کر مزے لیتے ہیں۔ سماج کے کچھ رویے ایسے بھی ہیں جنہیں عورت نہ چاہتے ہوئے بھی برداشت کرتی رہتی ہے کیونکہ اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں ظلم سہنے کی روایت کئی صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ میکے کی طرف سے بھی بیٹی کو حالات سے سمجھوتے کی تلقین کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں جب بیٹی کی شادی کی جاتی ہے تو

اس کو طرح طرح کی نصیحتیں کی جاتی ہیں اس کی پوری زندگی ان نصیحتوں پر عمل کرتے ہوئےاور اپنے باپ اور بھائی کی عزت کا خیال رکھنے میں گزر جاتی ہے ۔جب کہ ہر لمحہ اس کی اپنی ذات کی نفی ہوتی رہتی ہے جو قبر تک اس کا ساتھ دیتی ہے اور کسی کو بھی اس کی وفاداری اور قربانیوں کا احساس تک نہیں ہوتا۔وہ سلویا کے بارے میں لکھتی ہیں:

> اس کا باپ اوٹو بوسٹن یونیورسٹی میں پروفیسر تھا اور وہ نہایت سخت گیر انسان تھاسلویاکی ماں سے اس کے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں ہوئے وہ اپنے گھر کا مالک اور آقا تھا جس کی توجہ اور خوشنودی حاصل کرنے کے حربے سلویا کو بہت کم عمری میں سیکھنا پڑے۔[11]

ادا جعفری سلویا کی ماں سے متعلق جس رویے کاذکرکررہی ہیں۔وہ اس معاشرے کا عام اور معروضی رویہ ہے جو عورت مرد کے ماتحت ہوتی ہے ،مرد خود کو اس کا آقا اور اسے اپنا غلام سمجھتا ہے ۔جو چاہتا ہے اس کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔ایک عورت کبھی اپنے والدین کے ہاتھوں مجبور ہو جاتی ہے اور کبھی اپنی اولاد کو دیکھ کر مرد کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتی ہے اور ظلم وستم برداشت کرتی رہتی ہے۔ مرد اسی چیز کو عورت کی کمزوری سمجھتا ہےاورجیسا چاہے اس کے ساتھ سلوک روارکھتا ہے۔

> سلویا کو یقین تھا کہ اب ٹیڈ بھی کوئی ملازمت حاصل کر لے گا لیکن وہ اپنی شہرت اور کامیابیوں کے نشے میں سرشار تازہ تخلیقات میں مصروف رہتا گھر کے اخراجات کی پوری ذمہ داری سے سلویا پر چھوڑ دی تھی۔[12]

گھر کے اخراجات کی تمام تر ذمہ داری مرد پر ہوتی ہے لیکن اگر مرد اس قابل نہیں اور عورت نے وہ ذمہ داری خود اٹھا رکھی ہے تو ہمارا سماج کبھی بھی اس کو وہ مقام نہیں دیتاجو مرد کو حاصل ہے۔ عورت اگر گھر سے باہر اپنی ملازمت کے سلسلے میں نکلتی ہے تو اس کی ذمہ داریوں میں ذرا برابر بھی کمی نہیں آتی بلکہ اور اضافہ ہو جاتا ہے۔عورت کو اپنے بچوں کی پرورش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے تمام بنیادی فرائض جو اس کے ذمہ ہیں ہر حال میں پورا کرنے ہیں اور اس سب کے بعد بھی اس کی کوئی قدر نہیں کی جاتی چاہے ۔عورت کے حقوق نہ پورے کرنے کے باوجود بھی ان پر ظلم کرنا مرد اپنا فرض سمجھتے ہیں اور عورت کی وفا داری کو کسی خاطر میں نہیں لاتے۔

ادا جعفری نے خاتون ہونے کے ناطے عورت کے مسائل قلم بند کیے ہیں۔یہ مسائل نہ صرف اس دور بلکہ ہر دور میں عورت کو درپیش تھے ۔فطری طور پر دیکھا جائے تو عورت نہ ہی ذہنی طور پر پسماندہ ہے ، اور نہ ہی مفلس ہے بلکہ وہ بھی مرد کی طرح مضبوط ہے۔ اسے بھی سیاسی، سماجی اور معاشرتی عوامل سے اتنی ہی واقفیت ہے جتنا کہ مرد کو مگر اس کے باوجود مرد اس کو زیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

عورت کے دکھ درد میں نے آنکھ کھلتے ہی دیکھے اور بہت قریب سے دیکھے ہیں
عورت کا پہلا روپ جو میں نے دیکھا وہ میری ماں کا تھا آندھیوں میں چراغ کی لو
اونچی رکھنے والے ہاتھ مجھے یاد ہے۔[۱۳]

گویا عورت کی سرشت میں اس مردانہ سماج نے ظلم اور زیادتی برداشت کرنا لکھوادیا ہے۔چاہے اس کا تعلق کسی بھی طبقے، کسی بھی عمر اور کسی بھی سماج سے ہو وہ ہر سطح پر غیر مساویانہ سلوک سے دوچار ہے۔یہی احساس اسے عدم تحفظ میں مبتلا کیے رکھتا ہے۔

بری عورت کی کتھا میں معروضی رویوں کا مطالعہ:

کشور ناہید کا شمار جدید اردو شاعرات میں ہوتا ہے۔انھوں نے اپنی آپ بیتی بری عورت کی کتھا کے نام سے لکھی۔کشور ناہید کی بے باکی ،جرات اور باغیانہ طرز اظہار ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے ان کے اسی مخصوص انداز بیان کی وجہ سے انہیں شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔کشور ناہید نے ایک عورت ہونے کے باوجود زندگی کو مردانہ وار بسر کیا۔

ان کی آپ بیتی ایک ایسی عورت کی کتھا ہے جس نے فرسودہ رسومات ، سختی اور پابندیوں کے ماحول میں رہنے کے باوجود اپنی زندگی کے فیصلے روایت سے ہٹ کر کیے۔گھر والوں کی مخالفت کے باوجود اپنا علمی اور ادبی سفر جاری رکھا۔گھر میں جنسی امتیاز ہی ان کی باغیانہ طبیعت کی وجہ بنا۔کشور بچپن ہی سے خود دار اور حساس طبیعت کی مالک تھیں۔وہ اپنی آپ بیتی میں اپنی ذات سے جڑے واقعات کے ساتھ ساتھ معاشرے کی ہر عورت کی کہانی بیان کرتی ہیں۔وہ مشرقی عورت کی محکومیت ،جذباتی کشمکش جیسے مسائل کا ذکر اپنی آپ بیتی میں کرتی ہیں۔ایک طرف وہ عورت پر بے جا پابندیوں کے خلاف ہیں تو دوسری طرف آزادیٔ نسواں کے نام پر عورتوں کے استحصال پر رنج کا اظہار کرتی ہیں۔افتخار عارف ان کے لیے لکھتے ہیں۔

کشور ناہید ہمارے عہد کی رجحان ساز شاعرہ، نامور سوانح نگار، مشہور مترجم۔ مقبول کالم نگار اور پاکستان کی بیدار ئی خواتین کی تحریک کے حوالے سے عالمی سطح پر متعارف تخلیق کار کے طور پر عزت واحترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں خواتین میں شعور وآگہی کے فروغ کے لیے مسلسل جدوجہد اور بنیادی انسانی حقوق کے تحفظ کے احساس کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں کشور ناہید کی خدمات کا ہر سطح پر اعتراف کیا جاتا ہے۔[۱۴]

کشور ناہید نے خود نوشت میں مظلوم عورتوں کے عنوان سے تلمیحاتی و استعاراتی لہجے میں اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ان مظلوم خواتین کا عکس ان کو خود میں نظر آتا ہے۔کشور ناہید کو بھی روایات ،رسم و رواج کے خلاف بغاوت کے جرم میں بہت کچھ سہنا پڑا۔

بری عورت کی کتھا کے چودہ ابواب ہیں۔ جن میں کشور ناہید نے اپنی زندگی کے واقعات کو ترتیب وار بیان کیا ہے۔پہلے باب میں کشور نے سماج و معاشرے میں تہذیب و تمدن ،اقدار و روایات کے بدلتے ہوئے منظر نامے پاکستان کے سیاسی جوڑ توڑ، عوام کی صورت حال، مختلف ممالک کی ادبی تاریخ کو تلمیحاتی پیرائے میں بیان کیا ہے۔دوسرے باب میں انھوں نے تلمیحاتی اور استعاراتی لب ولہجے میں، دنیا کی مشہور و مظلوم خواتین کی رودادِ جبر پیش کی ہے۔ کشور ناہید نے اماں حوا سے اپنی داستان حیات کا آغاز کیا ہے۔ کشور "حوا" سے مخاطب ہیں اور یہ "حوا" کسی خاص مذہب، معاشرے اور قوم سے تعلق رکھنے والی "حوا" نہیں بلکہ دنیا کے ہر خطے ہر مذہب ہر معاشرے اور ہر طبقے میں ظلم وزیادتی سے برسرِپیکار حوا ہے۔

معروضی رویے سے یہاں مراد یہ ہے کہ معاشرے کی طرف سے عورت پر صادر کیے گئے کچھ خاص رویے یا حدود و قیود جن کے اندر رہ کر ہی عورت سماج میں قابل قبول بن سکتی ہے۔ اگر وہ ان حدود سے تجاوز کرے تو اسے باغی قرار دیا جاتا ہے۔ یہ رویے نہ تو مذہب کی طرف عائد ہیں اور نہ ہی ایک مہذب معاشرے کے بنیادی انسانی حقوق کے زمرے میں آتے ہیں، بلکہ یہ ایسے رویے ہیں جنہوں نے عورت کو ایک انسان کی بجائے کوئی بے جان شے بنا دیا ہے جو اپنی مرضی رکھنا تو درکنار اپنی سوچ بھی نہیں رکھ سکتی۔

کشور ناہید کی اس آپ بیتی میں جگہ جگہ ایسے رویوں کا اظہار ملتا ہے۔ وہ بہترین انداز میں ان رویوں کے خلاف آواز اٹھاتی آتی ہیں۔ یہ معروضی رویے صرف عورت کی عام زندگی اور رہن سہن تک محدود نہ تھے بلکہ مذہبی لحاظ سے بھی عورت پر کچھ پابندیاں تھیں جو مذہب میں تو نہیں تھیں مگر صرف عورت ہوتے ہوئے مذہبی اقدار اور عبادات میں تفریق پیدا کرتی تھیں۔ کشور ناہید نے بھی ایسے چند پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔

قرآن کو معنی کے ساتھ پڑھنا منع تھا اس طرح ثواب ضائع ہوتا ہے جو ان پڑھتے انھیں کہا جاتا تم

بس آیات کی سطروں پر انگلیاں پھیرتے رہو تمہیں قرآن پڑھنے کے برابر ثواب ملے گا۔ ہر مذہبی کام کو اللہ کے حکم کی طرح اماں کے حکم کی شکل میں لازمی ادا کرنا ہوتا تھا۔[۱۵]

یعنی معاشرہ اس قدر عورتوں پر اور ان کی مذہبی اور سماجی آزادی پر حاوی تھا کہ اس عہد کی عورت کو حقیقی اقتدار کو اپنانے کی بھی اجازت نہ تھی بلکہ صرف مذہب اس قدر اپنایا جائے گا جتنا معاشرے کی مرضی اور منشاء کے مطابق ہو گا۔ جس طرح مذہب کے اندر حدود اور قیود اپنی مرضی کی لگائی گئیں اس طرح عورتوں کی آزادی کو مذہبی رکاوٹ یا پابندی کہہ کر بھی سلب کیا گیا۔

گڑیا کھیلنا تو آواز "مت کھیلو ورنہ قیامت کے دن ان میں جان ڈالنی پڑے گی" دو چوٹیاں باندھنا تو تبر "اقیامت کے دن دو سانپ تیرے سر کے ساتھ باندھیں گے "چوڑیاں نہ پہنے تو دبکا: اللہ میاں چوڑیاں نہ پہننے والی کی نماز قبول نہیں کرتا قیامت کے دن پرسش ہو گئی چھت پر چڑھ جانا تو شور "اے ہے کوئی بلا چمٹ جائے گی۔[۱۶]

غرض یہ کہ عورت پر ہر طرح کی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں صرف اس وجہ سے کہ وہ عورت ہے اور عورت کا کوئی ایسا عمل قابل قبول نہیں ہوتا جو معاشرتی رویوں کے خلاف ہو۔ چاہے مذہب اسے اس کی آزادی دیتا ہو۔ کشور ناہید نے اپنی مرضی سے شادی کی تو ان کی والدہ نے کئی سالوں تک ان کا چہرہ نہ دیکھا۔ ایسا معاشرہ نہ صرف عورت پر بے جا پابندیاں لگا کر اس کی حیثیت کسی جامد و ساکت بت کی مانند کئے ہوئے تھا بلکہ اسے مرد سے بہت کم درجہ اور شے سمجھا جاتا تھا۔ یہ سوچ بھی گناہ تصور کی جاتی تھی کہ عورت مرد کے برابر ہو سکتی ہے۔ اس کے انکار کے لیے طرح طرح کی توجیہات دی جاتیں۔ "عورت تو ہے کم درجہ۔۔۔۔۔ ورنہ عورت خدا نہ ہوتی پیمبر ہوتی، مرد کے برابر ہوتی ہے اس لئے عورت سربراہ مملکت نہیں ہو سکتی"۔[۱۷]

الغرض عورت کی شناخت کے حوالے سے ایسے معروضی رویے اس عہد کی تمام خواتین لکھاریوں کی تحریروں میں نظر آتے ہیں عورتوں کی سماجی آزادی سلب کرنے میں بھی اکثر ان عورتوں کا کردار رہا جو خود ایسی پابندیوں کی عادی تھیں اسی لیے ان کے لیے برابری کا سوال گناہ تھا۔

ہمارے معاشرے کا عورت کے متعلق معروضی رویہ یہ ہے کہ عورت محض ایک چیز ہے جس کے ساتھ اپنی مرضی کا سلوک روا رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے اپنے کوئی جذبات و احساسات نہیں ہیں، نہ وہ آزادانہ سوچنے، سمجھنے پر قادر ہے۔ بس معاشرہ اور اس کے سرپرست جو حدود قیود اس کے لئے متعین کر دیں گے اس نے اپنی ساری زندگی انہی حدود کے اندر رہ کر گزارنی ہے۔ اگر وہ ان سے انحراف کرے گی تو باغی کہلائے گی اور اپنے خاندان کے لئے شرمندگی کا باعث بنے گی چنانچہ اس کو نہ چاہتے ہوئے بھی ہر جائز ناجائز فیصلے پر سر جھکانے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔

معاشرے نے عورت کو ہمیشہ ہی ایک بوجھ سمجھا ہے چاہے وہ بیوی، بہن، بیٹی یا کسی بھی شکل میں ہو اور اس کے ساتھ غلاموں جیسا سلوک ہی روا رکھا جاتا ہے۔ کشور ناہید اپنی آپ بیتی میں اس رویے کا ذکر کرتی ہیں کہ عورت کی زندگی کا فیصلہ کرتے ہوئے یہ معاشرہ دو پل نہیں لگاتا اور اس سے اجازت لینا تو دور پوچھنے کی بھی زحمت نہیں کی جاتی۔ معاشرہ عورت سے وہ حقوق بھی چھین لیتا ہے جو اس کا مذہب اسے دیتا ہے۔ یہ رویہ ایک مہذب معاشرے کی تخلیق نہیں کر سکتا کیونکہ جب جبر حد سے بڑھ جائے تو فرار کے راستے خود بخود دل و دماغ میں ابھرنے لگتے ہیں۔ کشور ناہید عورت کے ساتھ ہونے والے غیر منصفانہ رویوں کا ذکر اس انداز میں کرتی ہیں۔

> اب پوچھوں اماں! کبھی اپنی بیٹیوں کا گلہ گھٹتے دیکھا ہے؟ اس وقت جب ان کی اولاد کو ہی ماراستین بنایا جائے اور مقابلے پہ کھڑا کر کے باپ اپنے حصے کے باقی ظلموں کا حساب لے کر اطمینان کا سانس لے جب عورت کو الزام کی سولی پر لٹکا کر ہی مردانگی کو مکمل ہوتا محسوس کریں۔ جب تیری بیٹیاں اپنا حق مانگیں تو مار، تھپڑ، گھونسے اور تیل کے کنستر معہ ماچس کی تیلیوں کے ان کا مقدر ٹھریں جب اپنی مرضی کے خلاف بستروں کی زینت بنیں اور عفت نصیب کہلائیں جب ان کے بدن پر سگریٹ بجھائے جائیں اور سگریٹ سے جلتے بدن کی کراہوں کی قیمت لگائی جائے جب وہ مرد کی نامردی کو حیا اور سماج کی تہذیب سمجھ کر خندہ پیشانی سے قبول کریں مگر کوئی ان کی ضرورت کو حیثیت دینے کو تیار نہ ہو۔[18]

اس تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرہ اس قدر عورت کی آزادی اور اس کے حقوق پر قابض ہے کہ اس کی زندگی ایک جانور سے بھی بدتر ہے۔ اس کو غلط کو غلط کہنے کا حق حاصل نہیں۔ ہر حال میں عورت کو ہی ظلم کی چکی میں پسنا ہے صرف مرد کی جھوٹی انا اور شان کی خاطر اپنے خاندان کی عزت اور وقار کی خاطر اسے ہر وہ ظلم بھی برداشت کرنا ہے جو خود اس مرد کے لئے بھی قابل قبول نہ ہو۔ جب تک وہ اپنی خواہشات اور ذات کی نفی کرتی رہے گی۔ سب کے لئے عزت اور حیا کا باعث بنے گی اور جب اپنے حق کے لئے آواز بلند کی تو باغی کہلائے گی۔ اس بغاوت کی سزا کبھی اسے جسمانی اور ذہنی اذیت دے کر اور کبھی مختلف حادثات کا بہانہ بنا کر یا اس کی جان لے کر دی جاتی ہے۔

> یہ بھی عورت کا مقدر ٹھہرے کہ مذہب، تہذیب اور انسانیت کو مرد کے حق میں اور عورت کے خلاف، استعمال کیا جائے کبھی اس کا استحصال خوبصورتی کے نام پر، کبھی ذہانت کے نام پر کبھی وسائل کے نام پر اور کبھی غربت کے نام۔[19]

معاشرہ عورت کو مرد سے کم درجہ دیتا ہے۔ عورت پر بے جا پابندیاں عائد کر کے اس سے عورت کی نفی اور اپنی ذات کی بڑائی چاہتا ہے۔ دین و مذہب کا سہارا لے کر عورت کا استحصال کیا جاتا ہے۔ اس کو اخلاقیات سے گرائے جانے کی سعی کی جاتی ہے۔ زندگی کے ہر پہلو میں چاہے وہ دینی ہو، طبیعاتی ہو، یا پھر معاشی عورت ہی استحصال کا شکار

ہوتی ہے۔ مرد صرف اس لئے برتر و اعلیٰ ہے کیوں کہ وہ مرد ہے اور معاشرہ اس کی اس مردانگی کو قبول کرتا ہے۔

> یہ سچ نہیں ہے کہ کسی بھی مسئلے میں سزا مرد کو نہیں ملتی سزا عورت کو ہی ملتی ہے اسے خبر تھی کہ سید زادے سے یہ شادی نہیں کرنا چاہتی اسے دبے دبے ماحول میں نہیں رہنا چاہتی گھر والوں سے یہ بھاگتی ہے۔ رسموں سے بھاگتی ہے انقلاب کی باتیں یہ کرتی ہے نوکری کرنا چاہتی ہے۔ اس نے میرے سارے ارمان پورے کئے ہم دو آزاد شخص ایک گھر میں رہنے لگے میں ذمہ داریوں کے لئے آزاد۔۔۔۔ وہ سائیکل کی جگہ موٹر سائیکل پر اور پھر گاڑی میں۔۔۔۔ لک چھپ جانا۔۔ مکئی کا دانہ۔۔۔۔۔۔ بہت خوبصورت تھا موٹر لئے۔ انتظار کر رہا ہوتا کسی اور کا۔۔۔۔ سال کے کیلنڈر سے پہلے اس کے انتظار کی جگہ اور شخص بدل جاتے تھے۔[۲۰]

کشور ناہید یہاں معاشرے کا ایک بھیانک پہلو دکھانے کی کوشش کر رہی ہیں کہ جب کوئی عورت اپنا فیصلہ اپنی مرضی سے کر لیتی ہے تو مرد اسے ساری زندگی اس فیصلے پر پچھتانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کی مجبوری کا فائدہ وہ ساری زندگی اٹھاتا ہے عورت باوفا ہو بھی تو مرد اس کے ساتھ وفا نہیں کرتا اور اس کی زندگی کو تلخ بنا دیتا ہے۔ جب عورت کو خود کفیل دیکھتا ہے تو اپنی تمام ذمہ داریاں اس کے کندھوں پر ڈال کر عیش پرستی میں پڑ جاتا ہے۔ ان سب ذمہ داریوں کے پورا کرنے کے باوجود عورت کو ہمیشہ نوکری کے نام پر آزاد اور خود سر ہونے کے طعنہ سننے کو ملتے ہیں۔ الغرض عورت کا امتحان اس کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے اور مرنے تک جاری رہتا ہے۔ عورت اپنی ساری زندگی اس ظلم کی چکی میں پستے ہوئے گزار دیتی ہیں اور ہمارا معاشرہ یہ تماشا بڑی دلچسپی سے دیکھتا رہتا ہے۔

ہر شخص الگ مزاج کا حامل ہوتا ہے جو اس کی عادات کے طور پر نمایاں ہوتی ہے اور یہ مزاج عادات و اطوار اس کو اس کا سماج اور ارد گرد کا ماحول دیتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص الگ ملک اور قوم میں پیدا ہوتا ہے جو اس کی انفرادی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اسی طرح سے کشور ناہید نے اپنی آپ بیتی میں عورت کی پیدائش سے لے کر موت تک کے حالات و واقعات کو قلم بند کیا ہے کہ کیسے اس کی پیدائش کے ساتھ ہی اسے یہ جتلانا شروع کر دیا جاتا ہے کہ وہ عورت ذات ہے اس کی فکر اور سوچ کا دائرہ محدود ہے۔ تعلیم کی طرف توجہ دلانے کی بجائے گھریلو معاملات کی طرف لایا جاتا ہے کہ اس نے گھر داری سنبھالنی ہے اور یہ سارے رویے ایک عورت کو اس کے گھر اور معاشرے کی دین ہیں۔

> گھر محلے کی ایک اکائی کا حصہ ہوتا ہے ہر شخص کی دوسرے پر نظر ہوتی ہے مدد کے لیے بہت کم عیب نکالنے کے لیے زیادہ۔ ردی بوتلیں بیچنے والا اگر ڈیوڑھی سے صحن میں چلا گیا تو محلے والوں کو خبر ہوتی ہے کہ کتنی دیر بعد باہر آیا اگر سبزی والے سے ہمسائی نے ہنس کر بات کر لی ہے اور اسی سبزی والے نے دوسری بی بی کو جلدی سے سبزی لے کر چلتا کیا تو محلے بھر کی خبر ہوتی ہے کہ کس کے گھر کون آتا ہے کون کہاں جاتا ہے۔ کیا کھاتا ہے اور اور کس سے ملتا ہے یہ ساری خبریں گھر والی

سے زیادہ محلے والیوں کو ہوتی ہے اگر کوئی نوکری پیشہ عورت ہو تو سارے محلے کی عورتوں کو اس کے دفتر اسکول جانے کے وقت کا علم ہوتا ہے۔[۲۱]

مرد کو خود کے بنائے ہوئے اصول و ضوابط معیوب محسوس نہیں ہوتے۔ تاہم عورت کا اپنی مرضی سے سانس لینا بھی محال ہے کشور ناہید کی آپ بیتی میں اس کی وضاحت اس طرح سے ملتی ہے کہ کس طرح سے مرد کی غیرت دولت کے نشے میں سو رہی ہے۔

بہت سی باتیں ذہن بھلا دینے کا سلیقہ نہ سیکھے تو انسان تو خود اپنے اندر کی آوازوں سے پاگل ہو جائے شاید اسی وجہ سے جب کوارٹروں کی ایک کھولی سے ایک عورت باہر جاتی اور شام کو بن سنور کے واپس آتی تو اس کا میاں اسے کچھ نہیں کہتا گھر میں بچوں کے نئے کپڑے اسے بھی اچھے لگتے ہیں۔ گھر کا نیا سامان اسے برا نہیں لگتا اور ہمسائی کو اس کے بازار جانے کا وعدہ یاد دلانے کو بار بار چکر لگانے پڑتے ہیں۔[۲۲]

یہ سارے رویے مل کر عورت کی زندگی کو اجیرن کر دیتے ہیں۔ وہ ہر وقت مرتی اور جیتی ہے۔ کبھی شوہر کو کھونے کے ڈر سے کبھی ماں باپ کی عزت کے نام پر تو کبھی بچوں کے چھن جانے کے ڈر سے اس طرح کی رویوں کے بعد عورت ہر شے سے بے زار ہو جاتی ہے۔ کشور نے عورت کے کردار کو عورت کی زبانی اس کی خارجی صورتحال کے تناظر میں تلخ انداز میں تحریر کیا ہے تاکہ عورت کے ساتھ بہتر رویہ برتا جائے اور اس کو بھی انسان سمجھا جائے یہاں تک کہ اس کی اولاد بھی اس کے ساتھ غیروں والا سلوک کرتی ہے۔

زندگی کے اس sea saw پہ میں سوار تھی مگر اخلاقیات کے متضاد رد عمل کے باعث میرے اندر کی ذات نے اپنی اخلاقیات خود مرتب کی کہ جس کے سامنے میں خود جواب دیتی تھی میرے اندر کی ذات نے بحرانوں سے نکلنے کے لیے بھی خود لائحہ عمل مرتب کیا اس کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ اپنے اندر سفر شروع کر دو اور قبرستان میں پیروں مزاروں پر بیٹھنے والی داتا صاحب سارا دن پڑی رہنے والی بی بی بن جاؤ یہ میری رگوں میں دوڑتے ہوئے خون کے لیے شرمناک تھا۔

دوسرا طریقہ خود کلامی اور تحریر کا تھا یہ سچا ثابت ہوا خون کے رشتوں سے بھی مستحکم۔ اولاد سے بھی زیادہ قریب۔ بلکہ اولاد کا مسئلہ تو شاید میرے لئے انوکھا تھا گھر میں سارے مرد اور میں اکیلی عورت کے ہونے کا تمسخر بچے اور وہ بھی چھوٹے بچے نے یوں اٹھایا تھا کہ ہمارے گھر میں تو معہ کنبے کے سارے مرد ہیں آپ اکیلی عورت ہیں آپ ہمارا مقابلہ کیا کر سکیں گی۔[۲۳]

زندگی کے ہر موڑ پر عورت کو یاد دلایا جاتا کہ اس کا وجود مرد کے بغیر بے معنی اور ادھورا ہے چاہے وہ مرد اس کا

بیٹا ہو، شوہر ہو یا بھائی ہو ہر طور پر اس کو احساس کمتری میں مبتلا رکھا جاتا ہے۔ جس کو کشور ناہید نے ہو بہو بناڈر کے لکھ ڈالا اور عورت کو معاشرے میں اس کا اصل مقام دلانے کا احساس بیدار کیا۔ جب ہم مکمل غور کرتے ہیں تو سمجھ آتی ہے کہ سماج کس قسم کا رویہ اپنائے رکھتا ہے۔

معاشرہ عورت پر مکمل حاکمیت بھی رکھنا چاہتا ہے اور کئی بار اسے قبول کرنے سے بھی ہچکچاتا ہے۔ عورت کی پیدائش کو بھی بوجھ سمجھا جاتا ہے اور اس کی شادی بھی بوجھ ہے۔ یہ دوہری پالیسی اپنانے والا معاشرہ اس پر تسلط بھی رکھنا چاہتا ہے اور اس کی پیدائش پر خفگی کا اظہار بھی کرتا ہے۔ "میری پیدائش میرے گھر میں کوئی واقعہ یا خوشی کا لمحہ نہ تھا کہ میں پانچویں تھی اور لڑکی تھی۔"[۲۴]

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جس معاشرے میں مصنفہ پلی بڑھی ہیں اس میں عورت کی پیدائش کوئی خوشگوار خبر نہیں ہے بلکہ ایک بوجھ ہے۔ آج بھی کئی لوگ ایسی سوچ کے مالک ہیں۔ بیٹی پر بیٹے کی پیدائش کو ترجیح دی جاتی ہے۔ پھر زندگی میں بہن بھائی ہیں تو بچپن سے جوانی ہر جگہ عورت ذات کو سمجھوتہ کرنا سکھایا جاتا ہے۔ ہر معاملے میں عورت کو جھکنا سکھایا جاتا ہے کہ جھکنے میں ہی اس کی بقا ہے یعنی عورت کو ہر معاملے میں ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ "شادی کے بعد مطالبہ پر زور اصرار، نارضگی، لگتا ہی نہیں تمھاری شادی ہوئی ہے۔"[۲۵]

عورت کو یہ معاشرہ نام بدلنے یا نام رکھنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ یہی نہیں بلکہ عورت کو جسمانی لحاظ سے بھی دوسرے درجے کی مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ اس کی رنگت، اس کا قد ہر جگہ اسے دوسرے درجے میں رکھا جاتا ہے۔ کشور ناہید اس حوالے سے اپنی آپ بیتی میں کہتی ہیں:

> تنگ سیڑھیوں اور بند کمروں میں رشتے کے بھائیوں سے نہ ملنے کی پابندی نے بڑے رنگ دکھائے۔ نماز کے جنون کے بعد ستاروں کا علم جاننے کا جنون سوار ہوا۔ ستاروں کے علم کے متعلق جو کتاب بھی مل سکی چھپ چھپا کر پڑھتی۔ اماں رات کو دبے پاؤں آکر چھپ کر کوشش کرتی کہ مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لیں کہ شاید یوں لڑکوں سے ملنے کے بہانے تلاش کر رہی ہوں گی مگر ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی کہ میں تو ستاروں کے زائچے بنا رہی ہوتی۔ میں گھنٹوں قرآن پاک لے کر بیٹھتی اماں بھی بڑی خوش ہوتیں۔ جب دیکھا میں کچھ لکھتی رہتی ہوں، متفکر ہوئیں، بہنوں کے ذریعے پچھوایا۔ میں نے کہا قافیے تلاش کرتی ہوں۔ بہت مار پڑی اور قرآن پاک کے ساتھ کاپی لے کر بیٹھنا منع ہو گیا۔ ہاتھ کی لکیروں اور ستاروں کے زائچوں کی کتابیں جلا ڈالی گئیں اور ان لمحوں میں اماں نے ہمیشہ کہا، ہائے میں نے تجھے کیا کھا کے جنا تھا۔[۲۶]

ہمارے ہاں اگر مرد کوئی ایسی گری ہوئی حرکت کرتا ہے جو اخلاقی لحاظ سے اچھی نہیں تو اس کے لیے یہ کہہ کر چپ کرا دیا جاتا ہے کہ کوئی بات نہیں لڑکے ایسا کر جاتے ہیں۔ جبکہ عورت کے لیے یہ بھی قابل قبول نہیں کہ وہ اپنی

خواہش کا اظہار کرے یا اس کے مطابق کوئی کام کرے بلکہ اس کی تو پیدائش پر بھی افسوس کا اظہار کیا جاتا ہے یہ لڑکی کیوں پیدا ہو گئی۔ اس سماج میں اخلاقی ضابطے بھی لڑکے اور لڑکی کے لیے برابر نہیں ہیں۔ حیا بھی صرف عورت کو سیکھنی چاہیے شرم بھی عورت کرے اور خاموش بھی عورت رہے۔

ہر انسان دوسرے انسان سے جس طرح سلوک کرتا ہے اور انسانوں کو آپس کے تعلق کے نتیجے میں جس برتاؤ سے گزرنا پڑتا ہے انہیں ہم انسانوں کے معروضی رویے کہہ سکتے ہیں۔ ایک انسان کے رویوں، اس کی عادتوں اور اس کے طور اطوار کو بنانے اور بگاڑنے میں بہت سے عوامل، اسباب و محرکات ہوتے ہیں۔ انسان جس گھر میں پیدا ہوتا ہے اس کی ابتدائی پرورش سننے اور بولنے کے نتیجے میں عمل اور رد عمل کی تشکیل ہوتی ہے، وہ اس کی عادت بن جاتی ہے. انسان کے رویوں کی تشکیل میں دوسرا اہم عامل اس کا علاقہ اور محلہ ہے۔ مشہور مقولہ ہے انسان اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے۔

اسی طرح ہمارے سماج میں عورت کے معاملے میں بھی ایسے ہی رویے سامنے آتے ہیں۔ عورت کو ہوش سنبھالتے ساتھ ہی سمجھا دیا جاتا ہے کہ وہ ایک عورت ہے اس کو اگلے گھر جانا ہے۔ اس کا رہن سہن مردوں کی نسبت الگ ہے۔ پیدا ہوتے ہی لڑکا اور لڑکی میں فرق کیا جاتا ہے۔ معاشرے کی یہ سوچ کہ بیٹا ہمارے بڑھاپے کا سہارا بنے گا اور بیٹی نے تو بیاہ کر اگلے گھر چلے جانا ہے۔ بچپن سے اس کے ساتھ الگ رویہ اور برتاؤ روا رکھا جاتا ہے۔ بعض اوقات اس کی حیثیت کو بھی قبول نہیں کیا جاتا۔ ایک کے بعد دوسری بیٹی پیدا ہو جائے تو اس میں بھی عورت کو قصوروار سمجھا جاتا ہے۔ اگر تیسری بھی بیٹی ہی پیدا ہو جائے تو عورت کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے کہ یہ ہے ہی منحوس جو صرف بیٹیاں پیدا کرتی ہے۔ پھر بیٹے کے حصول کے لیے دوسری شادی کر لی جاتی ہے۔ ہمارے مذہب میں بیٹی کو رحمت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے کے رویے اس بات کو تسلیم نہیں کرتے اور اپنی مرضی کے مطابق مذہب میں بھی ہیر پھیر کرتے رہتے ہیں۔

کشور ناہید اپنی آپ بیتی میں لکھتی ہیں کہ عورت مرد کے حکم کے تابع ہوتی ہے۔ عورت کی گھٹی میں ڈال دیا جاتا ہے کہ وہ مرد کے بغیر کچھ نہیں ہے۔ اس کو مرد کی مرضی کے مطابق چلنا ہو گا اب پھر وہ چاہے باپ ہو بیٹا ہو یا بھائی یا شوہر ہمیشہ ان کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنی ہو گی۔

> اپنی مرضی کا لفظ عورت کی زندگی میں داخل ہے پیدا ہونے بڑھنے میں شادی شوہر کے انتخاب زندہ رہنے میں مرنے میں بھی وہ کے جنہیں کمرے میں بند کر کے زندہ جلا دیا جاتا ہے عصمت لوٹ کر گلہ گھونٹ دیا جاتا ہے اپنی مرضی کے شوہر کے انتخاب میں گولی سے اڑا دیا جاتا ہے یہاں بھی ان کی اپنی مرضی کہیں نہیں ساری عمر مرد کی مرضی کا کھانا پکتا ہے مرد کی مرضی کے کپڑے پہنتی

ہے زیور پہنتی ہے سجتی ہے لوگوں سے ملتی جلتی ہے بس شوہر کی مرضی اور اجازتوں اور طنابوں کے اندر اپنی مرضی اس کا علم اور ذائقہ تو ان کے لئے اجنبی رہتا ہے۔[۲۷]

تو اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جس دور میں کشور ناہید نے لکھا ان کو بھی ایسے رویوں کا سامنا کرنا پڑا یہ اقتباس اس دور کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ عورت کو مذہب نے جو حقوق دیے ہیں، ہمارا معاشرہ ان کو بھی قبول نہیں کرتا جس طرح اسلام سے پہلے کیا جاتا تھا۔

قانون بناتے وقت مذہب کی آڑ لی جاتی ہے عورت مرد کے رشتے میں ہر مذہب نے مرد کو فوقیت دی ہے کہ ہر مذہب مردوں کا لایا ہوا اور مردوں نے اس کی تشریح کی تو گویا عورت کے بارے میں مرد کی رائے یا قانون خدا کا قانون سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے عورت کا دل کرے یا نہ کرے جس مرد سے اس کی شادی معاشرہ کر دے اس کی یہ قانونی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ اس مرد کا حکم مانے اور جنس کے لیے جب مرد حکم دے حاضر اور پیش ہو جائے۔[۲۸]

غرض یہ کہ ہر دور میں عورت کو اس کا اصل مقام نہیں مل سکا عورت کو صرف مرد کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے اس کے علاوہ عورت کی کوئی پہچان نہیں ہے اگر وہ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائی گی تو بے حیا اور بد چلن کہلائے گی اور یہی ہمارے معاشرے کا المیہ ہے۔ ڈاکٹر شاہین مفتی لکھتی ہیں:

کشور سزا کی طلب گار ہے۔ اس کا جرم یہ ہے کہ اس نے اپنے لہو سے تعبیر خواب لکھی بلکہ اک جنوں بریدہ کتاب لکھی۔ تقدیس خواب فروا میں جاں گزاری، قاتل کو وصف تیغ والم سکھایا، عدد کی صلیب پر بھی محتسب رہی۔ ہوا کی زد پہ وہ چراغوں کی روشنی بنی۔ دوشیزگی کو سودائے شب گماں سے رہائی دلائی، اب زندگی کا آخری گھونٹ پی کر امر ہونا چاہتی ہے۔ کشور ایک ایسی زندگی کی طالب ہے جو کیلنڈر پر درج نہ ہو۔[۲۹]

شناسائیاں رسوائیاں میں معروضی رویوں کا مطالعہ:

ہمارے معاشرے میں عورت ہمیشہ سے ہی احساس کمتری کا شکار رہی ہے۔ کیونکہ یہ معاشرہ اسے اس کے حقوق اور آزادی نہیں دیتا۔ اس کو ایک جیتا جاگتا انسان سمجھنے کے بجائے صرف جنس سمجھا جاتا ہے۔ جسے چھپا، دبا کر رکھنا ہے۔ اسے ان تمام چیزوں سے دور رکھنا ہے جو اس کے اندر شعور اور آگاہی پیدا کر دیں۔ کشور ناہید نے ان سب حالات کو اپنی زندگی میں جھیلا اور محسوس کیا۔ اسی لیے وہ اپنی آپ بیتی میں عورتوں کی حق تلفی کی بات کرتی ہیں کیونکہ کہ کوئی بھی انسان اس وقت تک کسی کے دکھ اور درد کو سمجھ ہی نہیں سکتا جب تک اس کے اپنے وجود پر وہ اذیت نہ گزری ہو۔ کشور ناہید نے اپنی زندگی میں اپنے اور پرائے سب کے تلخ رویوں کو پرکھا اور اپنی زندگی کا مشکل ترین دور گزارا مگر اپنی

ذات کو ان رویوں میں کہیں کھونے یا دبنے نہیں دیا بلکہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ پر عزم رہیں۔ اپنی آپ بیتی میں وہ ایسی ہی عورت کے بارے میں بات کر رہی ہیں کہ صرف عورت کے ساتھ ہی ایسا سلوک کیوں کیا جاتا ہے۔

گھر جا کر کڑتی رہتی کہ اتنے بڑے ادیب آئے تھے۔ مجال ہے میں ان کے ساتھ بیٹھ سکوں۔ کیا مصیبت ہے کہ گھر آنا ہے باادب بیٹھنا ہے چھپ کر ناول اور شاعری پڑھنا ہے۔[۳۰]

کشور ناہید اس اقتباس میں عورت کی زندگی میں لگائی جانے والی بے جا پابندیوں کا ذکر کرتی ہیں کہ استاد کو تو روحانی والدین کا درجہ حاصل ہے لیکن یہ معاشرہ عورت کو اس حق سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ جنسی فرق کی بنا پر دن کے اجالے میں گھر واپس لوٹنا ضروری ہے اگر دیر سویر ہو گئی تو کئی نگاہیں سوال کریں گی۔ عورت کو گھر میں خاموش رہنے زیادہ بات نہ کرنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے کے طریقے غرض کہ تمام چیزوں پر روک ٹوک کی جاتی ہے۔ عورت کو کوئی اختیار نہیں دیا جاتا کہ وہ زندگی کو اپنی مرضی سے گزارے یا اپنی خواہشات کو پورا کر سکے۔ اسے اسی دائرہ کار میں رہ کر زندگی بسر کرنی ہے جو معاشرے نے اس کے لیے متعین کر رکھا ہے۔

ہمارا معاشرہ مردوں کا ہے۔ یہ عورت پر اپنا تسلط ہمیشہ قائم رکھنا چاہتا ہے۔ عورت کو مرد کے مقابلے میں کمتر اور کمزور سمجھنا، عورت کو ثانوی مخلوق اور زر خرید غلام کا درجہ دینا یہ ہمارے مرد معاشرے کا ہی خاصہ ہے۔ مرد عورت کے ساتھ جو مرضی سلوک روا رکھے، اس سے سوال کرنے کا حق کسی کو نہیں۔ عورت پردے میں رہے کسی سے بات نہ کرے، گھر سے بنا اجازت نہ نکلے یہ سب پابندیاں عورت کے لئے ہیں۔ کشور لکھتی ہیں۔

لوگ میرے ہونٹوں اور آنکھوں کی بے حجابی کی بات کرتے تھے مگر اب جبکہ میرے گھٹنوں تک میں پانی اتر آیا ہے۔ مجھے چلتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے۔ مجھے اپنے گزشتہ بھاگتے لمحات یاد آتے ہیں۔[۳۱]

کشور ناہید ایک بے باک خاتون تھیں۔ معاشرے کے معروضی رویوں کو بنا کسی خوف کے کہہ ڈالتی تھیں۔ وہ اس سماجی رویے کا ذکر کر رہی ہیں کہ ایک عورت کی علمی دعوت پر مدعو ہونے کو بھی مرد حضرات تیار نہیں ہوتے ان کے لیے یہ بات باعث تضحیک ہے کہ وہ عورت کے بلاوے پر پروگرام میں شرکت کریں۔ یہ بات مرد حضرات کی شان میں کمی کا باعث سمجھی جاتی ہے۔ اس حوالے سے کشور ناہید مزید لکھتی ہیں۔ "جب میں موضوع کے تعارف میں کچھ باتیں کرتی تو ان کو احساس ہوتا کہ اس خاتون کے بال کٹے ہیں۔ سر نہیں ڈھکا مگر قرآن شریف کے معانی جانتی ہے۔[۳۲]

کشور ناہید اس روایتی رویے کا ذکر کر رہی ہیں کہ جب عورت سماج میں اپنا مقام بنا لیتی ہے۔ مردوں میں اٹھتی

بیٹھتی ہے تو اسے مذہبی اور اخلاقی لحاظ سے بہت کمتر سمجھا جاتا ہے۔ اگر سوسائٹی میں آگے بڑھنے کے لیے خود اپنی ذات کو تھوڑا جدید طرز زندگی کے رنگ میں ڈھالتی ہے تو اس کے نتیجے میں ہمارے علماء اور مرد حضرات اس پر اسلام سے ہی خارج ہونے کا فتویٰ عائد کر دیتے ہیں۔ یہی اس سماج کا دوہرا رویہ ہے۔ کشور ناہید اپنے بارے میں بتاتی ہیں کہ انہیں عورت کے ساتھ ہونے والے مظالم اور زیادتیوں کا احساس اس لیے بھی زیادہ ہے کیونکہ وہ خود بھی اس کرب سے گزر چکی تھیں۔ انہوں نے بھی اپنی زندگی میں بہت سے تلخ رویوں کا سامنا کیا۔ کشور ناہید اسی رویے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ "جب میں نے شروع شروع میں نیشنل سنٹر میں علماء کو بلانے کی دعوت دی تو وہ جھجکے کہ ایک خاتون کے بلاوے پہ کیسے چلے جائیں"۔ [۳۳]

مرد سے عورت کا تعلق خواہ کسی بھی حوالے سے ہو اسے ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس تعلق کی بنا پر عورت کے کردار پر باتیں کی جاتی ہیں۔ اس عورت کا نام اس مرد سے جوڑ کر اس پر طرح طرح کی تہمتیں لگائی جاتی ہیں۔ یہی اس سماج کی سوچ ہے۔ اس کی مجبوری یا پھر اس تعلق کی نوعیت کو سمجھنا ضروری نہیں سمجھا جاتا بس الزامات کی بوچھاڑ کرنا اس عورت کی کردار کشی کرنا ہی ہمارے معاشرے کا انصاف ہے۔ اس معاشرے میں عورت کی اپنی ذاتی زندگی، اس کی سوچ یا اس کی اپنی شناخت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ کشور ناہید جگہ جگہ اس عورت کی بات کرتی نظر آتی ہیں۔

یہ آپ بیتی اگرچہ دیگر ادبی شخصیات کے تعارف اور احوال زندگی پر مبنی ہے مگر کشور ناہید نے یہاں بھی اپنی تانیثی فکر کو پس پشت نہیں ڈالا بلکہ اپنے انداز بیان کے مطابق جہاں عورت کے حق میں آواز اٹھانے کی ضرورت محسوس کی اسے بے دریغ کہہ ڈالا۔ اس آپ بیتی میں جہاں انہوں نے شخصیات کے احوال لکھے انہی میں سے ایک مضمون میں ریڈیو میں کام کرنے والے حضرات اور گانے والی خواتین کا بھی ذکر کیا اور جن خواتین نے گانے گائے ان کے ذاتی احوال کا ذکر کرتے ہوئے ان پابندیوں اور ناانصافیوں کا بھی ذکر کیا جو صرف انہیں عورت ہونے کی وجہ سے سہنی پڑیں۔ ایک جگہ وہ اپنی قریبی دوست اقبال بانو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> اقبال بانو کے بیٹوں نے پڑھنے لکھنے کے بعد اسی ماں کی آمدنی کو ناپسند کیا جس کے باعث وہ باعزت نوکریوں پر کھڑے ہو سکے تھے۔ ناراض ہو کر بیویوں کو لے کر دوسرے ملکوں میں چلے گئے ناراض تو وہ داماد بھی رہتا تھا جو ان کے گھر رہتا تھا ان کی کمائی کھاتا تھا۔ مگر ضد یہ کرتا تھا کہ اول تو گانا نہ گائیں اور اگر گائیں تو تصویر نہ چھپے میری بدنامی ہو گی۔ [۳۴]

ہمارے معاشرے کا یہ دوغلہ رویہ سالوں سے چلا آ رہا ہے کہ مرد ضرورت پڑنے پر عورت کی کمائی اور دولت

پر بغیر معترض ہوئے عیش کر لیتا ہے اور ذرا بھی غیرت کا مسئلہ محسوس نہیں کرتا مگر بعد میں وہی پیسہ اسے حرام لگتا ہے۔

کشور ناہید نے بھی اسی پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اقبال بانو کے بچے جوان ہوتے ہی ماں کی کمائی کو غلط سمجھنے لگ گئے او رانھوں نے اپنی راہیں جدا کر لیں اور داماد جس تھالی میں کھاتا اسی میں چھید کرنے میں لگا تھا۔ یہ ایک المیہ ہے کہ ایک عورت اپنی ذاتی خواہشات کو نظر انداز کر کے اپنے بچوں کو دنیا میں جینا سکھاتی ہے اور پھر وہی بچے ماں کی کمائی کو غلط ثابت کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ کشور ناہید ہمیشہ سے عورت کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک کے خلاف آواز اٹھاتی رہی ہیں اور جہاں انہیں زندگی کے کسی موڑ پر کوئی عورت ظلم کی تصویر بنی نظر آئی انہوں نے اپنی تحریر میں اسے جگہ ضرور دی۔ اسی طرح ایک جگہ کشور ناہید عابدہ پروین کے حالات بتاتی ہیں جو اقبال بانو سے ہی مماثل ہیں۔

> عابدہ پروین کا مسئلہ اور ہے شوہر کی وفات کے بعد سسرال والوں نے تدفین میں بھی شرکت نہ کرنے دی تو عابدہ نے اپنے بھائی کو مینجر بنا کر بڑے سائنسی انداز میں اپنے آپ کو کمرشلائز بھی اور محفوظ بھی کیا۔ بچیوں نے بڑی اچھی تعلیم حاصل کی اور عابدہ پر گزرتے دنوں کے ساتھ مجذوبیت کا رنگ گہرا ہوتا گیا۔[۳۵]

گانا اگر اتنی ہی بری بات ہے اور مذہب میں اجازت نہیں ہے تو مرد و عورت دونوں کے لئے منع ہے۔ مگر ہمارا معاشرہ عورت کے گانے کو ہی معیوب کیوں سمجھتا ہے۔ صرف گانا ہی نہیں عورت جب بھی گھر سے باہر نکل کر کوئی ہنر سیکھے یا اپنے ہنر سے کچھ کمائے اور گھر کا نظام چلائے تو اسے معاشرے کی بری نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور سب سے پہلے اس کے گھر کے مرد ہی اسے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں جیسے کہ یہ صرف مردوں کا معاشرہ ہے یا گھر کی چار دیواری سے باہر مردوں کی دنیا ہے۔

معاشرے کے یہی معروضی رویے تانیثیت کی تحریک کو پروان چڑھاتے ہیں اور عورت کو محرومیوں کا شکار بنانے کے ذمہ دار ہیں۔ اس ایک مضمون میں کشور ناہید نے کئی ایسی لڑکیوں کی داستان بیان کی ہے جو یا تو قتل کر دی گئیں یا پھر اپنا ہنر چھوڑ کر گھر کی ہو کر رہ گئیں۔

اس آپ بیتی میں کشور ناہید نے اپنے عہد کے بلند پایہ ادیبوں شاعروں اور ملکوں کی صورتحال کو تاریخی سطح پر اجاگر کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کشور ناہید کے پاس علم کی فراوانی موجود ہے۔ جس سے وہ نہ صرف اپنے گہرے مشاہدے کو بروئے کار لاتے ہوئے لوگوں کے متعلق بات کرتی ہیں بلکہ ڈراموں فلموں اور مشاعروں میں عورت کے مقام کو اس طرح سے بیان کرتی ہیں جس سے ان کے فیمینسٹ ہونے اور عورت کے ساتھ ہونے والی

زیادتیوں پر واضح احتجاج کا پتا چلتا ہے۔

> ڈراموں میں کام باقی دوستوں کے علاوہ ہمارے انور سجاد بھی ایکٹنگ کرتے کہانی کی تلاش کے ذریعے نئے موضوعات پر بحث کرنے کے لئے ایمبیسیڈر ہوٹل میں خالد سعید بٹ فاروق ضمیر اور انور سجاد بیٹھا کرتے تھے ان میں سے جو لمبی لڑکیاں ہوتیں ان کے مقابلے جو لوگ انور سجاد کے قد کے ہوتے تھے ان کے پیروں کے نیچے ٹپائی رکھ دی جاتی تاکہ وہ کم از کم برابر کے قد کے تو نظر آئیں۔[۳۶]

اقتباس کی روشنی میں دیکھا جائے معلوم ہوتا ہے کہ تو کس طرح سے عورت مرد کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ عورت کو بچپن سے یہ تربیت دی جاتی ہے کہ کے اس نے گھر داری سنبھالنی ہے لیکن دوسری طرف شادی کے بعد کی صورتحال میں وہ نہ صرف گھر کے کام کرتی ہے بلکہ مشاعروں, ٹی وی، ڈراموں اور فلموں میں بھی کام کرتی ہے۔ہے۔اس کے ساتھ پھر بھی ناروا سلوک کیا جاتا ہے۔

کشور ناہید کا بحیثیت خاتون زاویہ نظر مردوں سے بالکل مختلف ہے۔انہوں نے طاقتور مردوں کے معاشرے میں بے بس لاچار اور حق تلفیاں سہنے والی خواتین کی تصویر کشی کی ہے کہ کیسے اس مردوں کے معاشرے میں عورت بے بس ہے اور سماج کا رویہ کتنا منافقانہ ہے۔ہمارا سماج کس طرح عورت کے حقوق مسخ کر لیتا ہے۔کشور ناہید نے عورتوں کو ان کے حقوق و فرائض سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ان کے نزدیک عورت کو جب اپنے حقوق کا علم ہو گا تو وہ اوپر کیے گئے مظالم کے خلاف بغیر کسی سہارے کے آواز اٹھا سکے گی۔

ڈاکٹر قاسم یعقوب کشور ناہید کے بارے میں لکھتے ہیں:

> تاریخی اور نفسیاتی آزادی کے لیے جدوجہد کرتی نظر آتی ہیں۔عورت کا صحن اس کا قید خانہ ہے جہاں سے اسے کھلے آسمان تک دیکھنے کی آزادی ہے مگر گھر کی دیوار سے باہر دیکھنا اس کی فطری پابندی کے طور پر نافذ ہے ویسے بھی صحن کی محدود وسعت میں آنے والا آسمان کتنا وسعت یافتہ ہو سکتا ہے اس طرح صرف صحن بدلتے ہیں، عورت باپ مرد کے گھر سے شوہر کے گھر منتقل ہو جاتی ہے مگر سماج جو دیوار کے پیچھے ہے اسے اپنی آنکھ عطا نہیں کرتا کشور کا احتجاج اور عورت کے حقوق کی جنگ، اردو شاعری میں فیمنن مرحلے کی دریافت ہے۔[۳۷]

مرد عورت کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے اور وہ عورت کے ساتھ جیسا مرضی سلوک کرتا ہے کوئی مرد کو کچھ نہیں کہتا کیونکہ وہ مرد ہے۔مرد عورت کا محافظ سمجھا جاتا ہے۔ہے۔پھر وہ عورت چاہے اس کی بیوی، بہن، ماں اور بیٹی ہی کیوں نہ ہو اس کو دباؤ میں رکھنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

> خیر سے بھٹو صاحب کی پھانسی اور عورتوں کے بارے میں حدود آرڈیننس آگے پیچھے آئے پتہ چلا

کہ جیلیں عورتوں سے بھر گئیں کہ کسی نے اپنی ماں کو کسی نے بیوی کو کسی نے بہن کو زنا کے نام پر
اندر کرایا جائیداد پر قبضہ کیا اور آزاد زندگی گزاری۔[۳۸]

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرد کے لئے عورت کی کوئی اہمیت نہیں پھر وہ چاہے اس کی ماں ہی کیوں نہ ہو وہ اپنے مفاد کے لیے ماں جیسے مقدس رشتے سے بھی بے وفائی کر سکتا ہے۔ عورت اگر اپنے حق کے لیے آواز اٹھائے تو اس کی آواز کو دبا دیا جائے۔ المیہ تو یہ ہے کہ اس کو وراثت میں بھی حصہ نہیں ملتا اور اگر باہر کمانے کے لئے نکلتی ہے تو بھی بری نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ مرد سے بات کرے تو بد چلن کہلاتی ہے اگر مرد عورت سے بات کرے تو یہ عام بات ہے۔

مرد عورت کو اپنی زر خرید غلام کی سی حیثیت دیتا ہے۔ عورت کی اپنی کوئی مرضی نہیں اگر مرد چاہے تو وہ ہنسے وہ کہے تو روئے وہ ایک زندہ لاش ہے۔ جسے معاشرے کے مردوں کے مطابق زندگی گزارنی ہے۔ "روز اس بات پر لڑائی ہوتی تھی کہ تم مردوں کی طرح ہنستی ہو مگر نہ میرا رویہ بدلا اور نہ لڑائی بند ہوئی۔[۳۹]

ہمارے ہاں عورت مرد کی برابری نہیں کر سکتی اگر برابری کرے گی تو منہ کی کھائے گی۔ مرد طاقتور تھا ہے اور رہے گا۔ یہی ہمارے معاشرے کا رویہ ہے جو مرد کو طاقتور، عورت کو کمزور بناتا ہے اور معاشرہ عورت پہ ہر لمحہ تسلط تو قائم رکھنا چاہتا ہے ساتھ ہی یہ عورت کو ثانوی مخلوق بھی سمجھتا ہے۔ اس حوالے سے کشور ناہید لکھتی ہیں:

ہندو دیوی کی پوجا تو کرتے ہیں مگر عورتوں کو ہماری قوم کی طرح پاؤں کی جوتی ہی سمجھتے
ہیں۔ کملا کا کہنا ہے کہ ہماری دنیا کے بے شمار مرد، عورت کے نو ماہ کے حمل کے برابر کا پیٹ اٹھائے
پھرتے ہیں۔ چونکہ ان میں خدا نے تخلیق انسان کی صلاحیت عطا نہیں کی اس لیے وہ اس کا بدلہ
لینے کو عورت پہ ہر طرح کے مظالم کو روا سمجھتے ہیں۔[۴۰]

یہ اقتباس اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ معاشرے نے کلی طور پہ عورت کو اپنا محکوم سمجھ رکھا ہے یا یوں کہیں کہ اس کی ذات کو ٹھکرا ہی دیا جاتا ہے۔ اس کی پیدائش، تعلیم، رائے، خواہش کا احترام نہیں کیا جاتا بلکہ ایسے معاشرے میں اپنی خواہش کا اظہار کرنا عورت کے لیے گناہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ کسی قسم کی خواہش کا اظہار نہ کرے۔ عورت پر ظلم کرنے کو مرد نے اپنا حق سمجھ لیا ہے۔ عورت کی تعلیم مرد کی تعلیم سے زیادہ نہ ہو، عورت مرد سے زیادہ آگے نہ بڑھے، عورت مرد سے پوچھے بغیر سانس بھی نہ لے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ معاشرہ عورت کے آگے بڑھنے سے خوفزدہ ہے اور ہر معاملے میں عورت کو پس پشت رکھنا اس کا شعار ہے۔

جو رہی سو بے خبری رہی میں انفرادی تشخص کا مطالعہ:

انفرادی تشخص سے مراد بحیثیت فرد عورت کی شناخت اور اس کے وجود کو تسلیم کرنا ہے۔ اس سے معاشرے

میں عورت کے وجود کی قبولیت اور اس کی موجودگی پر ایمان لانا لازم ہو جاتا ہے۔

ادا جعفری نے ہمیشہ معاشرے کے پسے ہوئے طبقے کو زبان دی ہے اور اس مسلط کردہ ظلم کی زنجیروں کی نشاندہی کی ہے۔ جہاں انہوں نے عورت کے لیے تانیثی سوچ رکھی ہے وہیں ایسے پہلو بھی اجاگر کیے جہاں عورت قید و بند یا بے جا پابندیوں کے خلاف ایک انفرادی سوچ رکھتی نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی میں ایسی خواتین کا ذکر کیا جو محرومیوں کا احساس کر کے اس ظلم کے خلاف عملی بغاوت کرتی نظر آتی ہیں:

> ہر ماں اپنی عمر بھر کی فرمانبرداری کے صلے میں اتنی کامیابی ضرور حاصل کرتی رہی کہ اس کی بیٹی کا نقش قدم اس رہگزر حیات میں نسبتاً اونچی اور ہموار سطح پر ہوں۔ برصغیر میں اگلے زمانوں کی عورت نے اپنی تمام محرومیوں کا معاوضہ اتنا ہی چاہا کہ اس کی اگلی نسل کو سانس لینے کے لیے تھوڑی سی اور کھلی فضا میسر آجائے وہاں ایک دو نفس کی اجازت مل جانا بھی کچھ کم نہیں تھا۔ بے شک وہ شاد کام رہیں۔ عورت نے جینے کے لیے بڑا طویل سفر کیا ہے۔[۴۰]

کوئی بھی انسان اپنے برے وقت کو اس امید پر برداشت کرتا رہتا ہے کہ ایک دن یہ غم کے اندھیرے خوشیوں کی نوید لے کر آئیں گے۔ عورت بھی اپنی اولاد کے جوان ہونے کی آس میں ہر زیادتی برداشت کرتی ہے۔ وہ یہ سوچتی ہے کہ اس کی اولاد اسے وہ مقام دلوائے گی جو اسے نہیں ملا جس کی وہ حق دار تھی۔ عورت یہ بھی جانتی ہے کہ اگر وہ حالات سے ہار مان کر اپنی اس زندگی سے چھٹکارے کا سوچے بھی تو اس کی اولاد کو دوہری اذیت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ مرد تو شادی رچا کر اپنی نئی دنیا بسالے گا مگر بچوں کو ان کی ماں کبھی نہیں ملے گی۔ ایک اور جگہ ادا جعفری عورت کے انفرادی رویے کی عکاسی کرتے ہوئے جامع انداز میں لکھتی ہیں: "بات یہ ہے کہ عورت موت کا استقبال تو ایک ہی بار کرتی ہے لیکن جنم بار بار لیتی ہے۔[۴۱]

یعنی عورت زندگی میں خود کو کئی کرداروں میں ڈھال کر عمر گزار دیتی ہے کبھی وہ ایک بیٹی کے روپ میں اور کبھی ماں کے روپ میں اپنی حیثیت منوانے میں لگی رہتی ہے جس میں اس کی ذات کہیں بہت پیچھے رہ جاتی ہے۔ لڑکی کو بچپن سے ہی یہ تربیت دی جاتی ہے کہ تمہارا کام ہی دوسروں کی خدمت کرنا ہے۔ کولہو کے بیل کی طرح اپنے کام میں جتی رہو۔ اپنے کان آنکھیں بند کر کے اپنے فرائض نبھاتی رہو۔ صلے کی امید نہ رکھو۔

بری عورت کی کتھا میں انفرادی تشخص کا مطالعہ:

کشور ناہید لکھتی ہیں خواتین جن مظالم و زیادتیوں کا شکار ہیں وہ اپنے دکھ کسی کو نہیں بتا سکتیں۔ کوئی در ایسا نہیں جو ان کی فریاد کو سنے اور ان کے دکھوں کا مداوا کر سکے یہاں تک کہ عورت کی اپنی کوئی شناخت نہیں۔ نہ ہی اس کے وجود کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسے دنیا کی کمزور مخلوق کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس کی سوچ اس کے وجود کی نفی کو مرد اپنا

حق سمجھ کر نظر انداز کرتے ہیں۔ عورت کا اپنا وجود نہیں ہے۔ عورت کو آدم کی ٹیڑھی پسلی سے تخلیق کیا گیا ہے۔ اسے آدمؑ کو ورغلانے والی کا خطاب دیا گیا۔ آدم کو ورغلا کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کروائی اس لیے اس کے شوہر کو مجازی خدا کا درجہ دیا گیا۔

حوا نے اپنی کہانی کسے سنائی تھی!
آدم کو ـــــ اس نے تو مشہور کر دیا میں اس کی پسلی سے نکلی تھی۔ [۴۲]

حوا "زمین کو اپنی روداد سناتی ہے تو زمین کا جواب یہ ہے کہ تمہارے لیے ایک محدود دائرہ ہے تم اسی میں زندہ رہو ورنہ میرے اندر دفنا دی جاؤ گی۔ کشور ناہید سوال کرنے کے انداز میں حوا سے مخاطب ہیں کہ تمہاری فریاد کوئی نہیں سنے گا۔ کیوں کہ تمہارا اپنا کوئی وجود نہیں اس لیے تم شکوہ شکایت کا حق نہیں رکھتی۔ کشور ناہید مختلف سماجی تناظرات سے تعلق رکھنے والی مظلوم خواتین کو ان کے ناموں سے مخاطب کر کے ان کی بے بسی اور لاچارگی کی داستان سناتی ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ عورتوں کی مظلومیت کی داستانیں اب بھی وہی ہیں بس نام بدل گئے ہیں۔ عورت ازل سے ظلم کی چکی میں پس رہی ہے اور پستی رہے گی۔ دنیا کے کسی نا کسی کونے میں عزت اور غیرت کے نام نہاد ٹھیکے دار اس کی تضحیک کرتے آئے ہیں کرتے رہیں گے۔ کشور ناہید نے اپنی اس آپ بیتی میں بہت سی خواتین کو مخاطب کر کے ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر سوال اٹھایا ہے۔ ان کے ساتھ کیے گئے ظلم کی داستانیں تو ملتی ہیں مگر تاریخ میں ان کے مجرموں کو سزا کیا دی گئی اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ وہ لکھتی ہیں:

اندھی صفیہ بی بی نے کہ ـــــ میں نے تم سے پوچھے بنا تمہاری کہانی سنا دی۔ حرام کا بچہ جننے کا قصور بھی میرا تھا اور کوڑوں کی سزا بھی میرے لیے تھی۔ حوا بلبلا اٹھی ـــــ "کس نے دی تھیں سزا۔ کیا اس عمل میں تم اکیلی تھیں، بالکل اکیلی۔ [۴۳]

جن مظلوم خواتین کا ذکر کشور ناہید نے کیا ہے ان میں صفیہ بی بی بھی شامل ہے۔ صفیہ جو آنکھوں کی بینائی سے محروم تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا مجرم کون ہے جس نے اس کی عزت پامال کی۔ اس کے نتیجے میں ایک بچے کی ماں بنی اور اس جرم میں اسے کوڑوں کی سزا دی گئی۔ ہمارے معاشرے کی بے حسی عروج پر ہے۔ بجائے اس کے کہ اس کے مجرموں کو ڈھونڈ کر عبرت ناک سزا کا مرتکب ٹھہرایا جاتا۔ مظلوم کے ساتھ مزید ظلم یہ کہ اسے ایسے گناہ کی پاداش میں کوڑے مارے گئے جس کی نہ وہ قصور وار تھی، نہ ہی اس ظالم کو جانتی تھی، اور نہ ہی اس سب میں اس کی مرضی شامل تھی۔ اس کا مجرم ایک مرد ہی تھا اور سزا دینے والے بھی مرد تھے۔

انفرادی تشخص سے مراد وہ تشخیص ذات ہے جو عورت معاشرے کی پابندیاں اور حدود اور قیود کے اندر رکھتی ہے کہ آخر اس کے ساتھ ہی ناانصافی کیوں کی جاتی ہے مرد کو تو اس کے حصے سے بڑھ کر ملتا ہے مگر عورت کو حصہ

لینے کا شعور بھی نہیں دیا جاتا۔ کشور ناہید نے جہاں معاشرے کو منافقانہ چہرے کو بے نقاب کیا ہے وہی عورت کو شعور ذات بھی سکھایا ہے اور خود اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر سوال اٹھایا۔

> مجھے غصے میں بڑبڑانے کی عادت ہمیشہ سے تھی میں گھر پر بھی بھائیوں کے فقرے سنوں بلبلاؤں۔ بھلا عورت کیوں شعر نہیں کہہ سکتی ہے مگر کسی کے سامنے اپنے غصے کا اظہار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ [۴۴]

ایک اور جگہ کشور ناہید بچپن کے حالات بیان کرتے ہوئے کہتی ہے:

> مجھے یاد آیا کہ ایک زمانے میں میری حرکتوں سے تنگ آکر اماں نے مجھے کسی بی بی کے پاس قرآن ختم کرنے کے لیے بٹھا دیا۔ ان کا گھر کچھ دور گلی کے نکڑ پر تھا۔ وہ بی بی پہلے تو اپنے گھر کے برتن دھلواتیں یا گھر میں جھاڑو دلواتیں، آٹا گندھواتیں، اور کہتی "حضرت بی بی فاطمہ سارے کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھیں۔ تم کو بھی عادت پڑے گی تو سکھی رہو گی۔" میں سپارہ سامنے رکھے بڑبڑانے لگتی "کیا مصیبت ہے گھر میں اماں مصالحہ پسواتی ہیں اور ہاتھوں میں مرچیں لگتی ہیں۔ بوا جھاڑو دلواتی ہیں اور چنا ہوا دوپٹہ گندا ہوتا ہے۔" [۴۵]

کشور ناہید شروع سے ہی سماج کے خلاف آواز اٹھانے کی عادی تھی بچپن سے جوانی تک ان کا یہ رویہ اور آواز مضبوط دلائل کے ساتھ بلند ہوتی گئی اور انہوں نے عورت کو اس کا شعور ذات دینے اور معاشرے میں اس کی انفرادی حیثیت منوانے میں ہمیشہ قلم سے جہاد کیا۔

> لوگ فرعون کے زمانے کی عبرتیں سناتے ہیں اس سے تو اسلام سے پہلے کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ اسلام نافذ کرنے والوں اور شرعی عدالتوں نے تو یہ بھی کہہ دیا ہے کہ بلوچستان کی ۱۳ سالہ بچی 'باپ کی زیادتی کی شکایت 'ماموں کے اکسانے پر کر رہی ہے کہ ماموں بچی کے حصے کی جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتا ہے دیکھ رہی ہوں۔۔۔۔ میں سن رہی ہوں۔ [۴۶]

ایک اور جگہ کشور ناہید صاحبہ لکھتی ہیں کہ ہمیں نہ صرف طرح طرح کی پابندیوں کا سامنا رہتا ہے بلکہ پڑھنے کی کتابوں کا تعین بھی ہم اپنی منشا سے نہ کر سکتی تھیں۔ عورت کو اتنا ہی علم دلوایا جاتا ہے جتنا یہ معاشرہ چاہتا ہے۔

> اور جب میں نے کتاب لے جا کر بھائی سے پوچھا اس میں کیا ہے جس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ میں نے کئی بار پڑھا مجھے پتا نہیں چل رہا۔ تڑاخ سے میرے منہ پر تھپڑ اور کتاب ہاتھ سے چھین لی گئی۔ کس کس کی کتاب ہاتھ سے نہیں چھینی گئی۔ بچپن میں گھر والوں نے اور بڑے ہو کر سرکاروں نے مگر ملال کی کونسی بات اپنی تاریخ کو دیکھو۔ چوراہوں پر کتابیں جلانے کے ورق تمہارا ہی ورثہ ہیں۔ [۴۷]

ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناہید صاحبہ سماج کے اس تلخ رویے پر طنز کرتی نظر آ رہی ہیں کہ بچپن میں گھر والوں نے کتاب چھین لی اور جوانی میں جب میں نے اپنی کتابیں لکھیں تو انہیں بین کر دیا گیا یا جو کتابیں پڑھی تھی وہ بین کر دی گئی۔ کتابیں چھیننے کا یہ رویہ ہمیشہ چلا آ رہا ہے۔ اس سماج کے مردوں نے ہی یہ بھی تعین کرنا ہے کہ ہمیں کون سی کتاب پڑھنی ہے اور کون سے نہیں یہ ناہید صاحبہ صدائے بغاوت بلند کرتی نظر آتی ہیں کہ سماج کی پابندیاں لا محدود ہیں۔

> مجھ سے میرے ایک لبنانی دوست نے پوچھا "خنا کی شاعری پڑھی ہے؟" میں نے کہا "جہاں تک دستیاب ہوئی "اس نے کہا "اور دور جاہلیہ کی شاعری میں نے کہا میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ لبنانی دوست نے کہا اصل علم اور اصل شاعری "میں نے کہا "میں اس بارے کچھ نہیں جانتی "لبنانی دوست نے کہا "اصل علم اور اصل شاعری تو اس وقت تھی "ہمیں تو سکول کے نصاب میں وہ شاعری پڑھائی گئی ہے۔ مگر ہمیں تو مذہب کے نام پر بہشتی زیور' پکی روٹی اور کاما سوترا جیسی کتابیں جائز' علم کے دروازے بند! دور جاہلیہ کی شاعری نامنظور! ان کنت من الظالمین۔[۴۸]

اس پیرے میں بھی کشور ناہید کتابوں کی پابندی پر صدائے احتجاج اور اختلاف رائے رکھتی نظر آتی ہیں کہ صرف گھر یا باہر ہی کتابوں کی پابندی نہیں تھی بلکہ نصابی سطح کی کتابوں میں بھی پابندیاں عائد ہیں اور مذہب کے نام پر بھی بہشتی زیور سے آگے کچھ سوچنے کا بھی رواج نہیں تھا اور دوسری مذہبی کتابیں جائز نہیں تھی۔ غرض یہ کہ اس آپ بیتی میں جگہ جگہ کشور ناہید زمانے کے رواج کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی نظر آتی ہیں اور اپنے ذاتی رویے کا اظہار کرتی نظر آتی ہیں۔

ایک عورت اپنے بارے میں کیا سوچ رکھتی ہے یا ایک عورت خود کو اپنی طرح سے کہاں دیکھتی ہے۔ میں کیا ہوں میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ عورت کی ذاتی پہچان بھی کوئی وجود رکھتی ہے یا نہیں۔ ان سب کا اظہار کی آپ بیتی میں ملتا ہے۔

> گزشتہ دنوں اک عام سی لڑکی جب امید سے ہوئی تو اس کی خوشی اور اس کا والہانہ پن دیدنی تھا۔ وہ بار بار مجھ سے لپٹ کر مجھے جھنجھوڑ کر کہتی، "میں ماں بننے والی ہوں، میں ماں بننے والی ہوں۔" اس وقت میں نے پہلی دفعہ خود کو کٹھکٹھا کے پوچھا تم کہاں تھیں، تم پر یہ کیفیت یہ سرشاری کیوں نہیں آتی، جواب آیا یاد کر جب تم صبح پانچ بجے اٹھ کر گھر کی صفائی، ناشتہ بنا کر بس میں بیٹھ کر یونیورسٹی، ۱۱ بجے یونیورسٹی سے فارغ ہو کر بس اور پیدل سمن آباد سے دفتر فارغ ہو کر بس پر لکشمی چوک۔ پھر گھر کا کام سسرال کی دھمکیاں، رات گئے تک یونیورسٹی کے لیے پڑھنا۔ اس دوراں بس ایک دن یہ پتہ چلا کہ امید سے ہوں اور جس دن دفتر نہیں گئی پتہ چلا کہ بچہ ہو گیا۔[۴۹]

یہ اقتباس ایک عورت کی مکمل تصویر ہے۔ بھلے ہی ہر عورت کی کہانی نہیں لیکن کئی عورتوں کے جذبات کی نمائندگی ضرور کرتا ہے۔ وہ خود کے لیے کہیں بھی کچھ نہیں کر رہی اس نے کام بھی کرنے ہیں اس نے بچے بھی سنبھالنے ہیں آنے جانے والوں کی جلی کٹی بھی اسی نے سننی ہیں۔ اپنے لیے اس کے پاس وقت ہی نہیں۔ پھر معاشرے کی لگی لپٹی پابندیاں کس لیے؟

اس کا کیا قصور ہے کہ وہ اس معاشرے کا حصہ ہے یا اس کا یہ قصور ہے کہ وہ اک عورت ہے۔ انفرادی تشخص سے مراد ہے کہ سوسائٹی میں عورت کی منفرد طور پر کیا شناخت ہے۔ کیا عورت احساس کمتری کا شکار ہے کہ ہر معاملے میں مرد اور عورت کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔ پھر جب بات اس کی شخصیت کی آتی ہے تو وہ انوکھی ہو جاتی ہے۔ اسے مرد کے مقابلے میں کمزور سمجھا جاتا ہے لوگ اسے حقیر نظروں سے دیکھتے ہیں۔

کشور ناہید نے مرد اور عورت کے امتیاز میں وہ اہم نکات بیان کیے ہیں جو تلخ ضرور ہیں لیکن حقیقت کے بہت قریب ہیں۔ جس کی وجہ سے انہیں حقیر نظروں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

> عورت مرد کا مقابلہ تم میرا کیا مقابلہ کروں گی جس کی صحبت میں بد عادت پڑی ہے کون ہے وہ خوش نصیب سارے ملک میں اشتہار اور ان ترقی پسند کی بھی انگلیاں اٹھ رہی ہیں۔ عورت برابری کا نعرہ انقلاب کے نام پر مارتے ہیں ۔ اخلاق کی ساری ضرورت صرف عورت کو ہے، ٹی وی پر مرد جائے تو ہنر مند عورت جائے تو بد کردار پبلسٹی کی شوقین کہلائے ریڈیو پر مرد کو چاہے صرف صدا لگانے کا موقع ملے۔ آپ دربندی قرار پائی عورت کو کسی پروگرام میں کام کرنا آئی اسی کا بہانہ کہلایا جائے مرد کا آگاہی میں اطلاع شام کو تو میں جانا ضرورت اور عورت کا اطلاق باوجود سرکاری ضیافتوں اے جان ابھی حق زوجیت سے تجاوز ہونے کے مترادف قرار پائے مرد کا بے اطلاع گھر سے غائب رہنا اس کی آزادی کا حصہ ہے: عورت کا اطلاع دے کر انفرادی سطح پر کسی کامیاب میٹنگ کے جانا بے لگام آزادی کا نام ٹھہرے۔[۵۰]

اس اقتباس میں مرد اور عورت کے درمیان فرق کو واضح طور پر کشور ناہید نے بیان کیا ہے۔ اس وقت عورت کو اپنے حق میں بولنے کی آزادی نہ تھی۔ کشور ناہید نے ایسے وقت پر عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر قلم اٹھایا اور اس کے حق میں آواز کا بیڑہ اٹھایا" جب ان کا لڑکا امریکی اور دیسی لڑکیوں کے ساتھ گھومتا اور راتوں کو دو بجے آتا میں لڑتی تو ساس کہتی مردوں کا کام ہی باہر پھرنا ہوتا ہے۔ ہمارے لڑکے ہی اتنے خوبصورت ہیں ان پر لڑکیاں مرتی ہیں" لفظوں کے بہترین چناؤ نے کشور ناہید کو خوب عزت بخشی۔

سہاگ رات بھی عجب آشوب رات تھی ہم اکٹھے تھے اک دوسرے سے چھپ رہے

تھے۔ دونوں کو اس ناگہانی سنجوگ پہ اعتبار ہی نہیں آرہا تھا۔ اس کے سونے کے بعد ساری رات سیڑھیوں میں بیٹھی رہی کہ اس کے پاس صرف ڈھائی روپے ہیں زندگی کیسے گزرے گی۔[۵۱]

شناسائیاں رسوائیاں میں انفرادی تشخص کا مطالعہ:

انفرادی تشخص عورت کی ذات کی وہ پہچان ہے کہ آخر عورت کی معاشرے میں کیا حیثیت ہے۔ عورت کا اس معاشرے میں کیا مقام ہے۔ عورت یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ آخر میری بھی کوئی حیثیت ہے یا نہیں میری بھی مرد کی طرح ایک الگ شناخت ہونی چاہیے۔ جس معاشرے میں مرد سانس لیتا ہے وہاں عورت کی کیا حیثیت ہے۔ مرد کو تو تمام حقوق حاصل ہیں لیکن عورت کے ساتھ ناانصافی کیوں کی جاتی ہے آخر مرد بھی تو عورت کی ہی گود میں جنم لیتا ہے اور پرورش پاتا ہے اس کے باوجود جو حیثیت اور مرتبہ مرد کو حاصل ہے وہ عورت کو کیوں نہیں حاصل۔

عورت آخر یہ سوچنے پر مجبور کیوں ہے کہ میرا بھی ایک وجود ہے میرے بھی اپنے معاملات، میرے دکھ، میری تکلیف میری پریشانیاں بھی ہیں۔ مرد کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہے پھر عورت کے ساتھ ایسی ناانصافی کیوں کی جاتی ہے جس طرح مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی پسند ناپسند کے مطابق زندگی گزارے۔ عورت اس حق سے کیوں محروم رکھی جاتی ہے۔

> ہوا یہ کہ بھٹو صاحب نے لاڑکانہ میں تمام ملکوں کے سفیروں کے لیے زبردست پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ لاڑکانہ ریلوے اسٹیشن کو بہت بنایا سنوارا گیا تھا۔ شام کی محفل میں نیلو کو رقص کرنے کے لیے بلانے کو وہی ترکیب نمبر ۹ یعنی پولیس کے ذریعے کہا گیا کہ حکم آیا ہے چلنا ہے رقص کرنا ہے نیلو کو یہ بات پسند نہ آئی اس نے زہر کھانے کی کوشش کی اور لاڑکانہ نہیں گئی۔ اس کی جرات رندانہ پر سب نے داد دی اور یہ تذکرہ بہت دن تک جاری رہا۔ جالب نے مشہور زمانہ نظم تو کہ ناواقف آداب غلامی تھی مگر۔۔۔۔ رقص زنجیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے۔ لکھی۔ ریاض شاہد نے اسے مہدی حسن سے گوایا اور نیلو پر ہی پکچرائز کروایا۔[۵۲]

کشور ناہید نے عورت کے شعور ذات کو بھی سراہا اور اس کا جابجا تذکرہ کیا کہ مرد عورت کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر نہیں رکھ سکتا ہر مرد کی طرح عورت بھی ایک آزاد انسان کے طور پر پیدا ہوئی ہے اور اپنی زندگی کے فیصلوں کا حق رکھتی ہے۔

الغرض انہوں نے ہمیشہ نسائیت کو ترجیح دی اور وہ عورتوں کے حقوق کے لئے قلم سے جہاد کرتی نظر آتی ہیں۔ نہ صرف ان کی شاعری میں بلکہ نثر میں بھی تانیثی شعور ان کی اولین ترجیح ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ جبر کا شکار ہو کر بھی صرف عورت ہی معاشرتی ناہمواریوں پر نوحہ کناں ہے اسی بنا پر وہ ہر عورت کو شعور ذات سے آشنا کرنا چاہتی

ہیں۔

انفرادی تشخص سے متعلق آپ بیتی کو دیکھا جائے تو عورت کی کوئی انفرادی شخصیت نہیں ہے وہ جو بھی ہے مرد سے ہی ہے۔اسے حسن کی دیوی بنا کر ٹی وی فلموں میں بطور نمائش استعمال کیا جاسکتا ہے پیسے کمانے کے لئے صبح سے شام باہر دھندا کروایا جاسکتا ہے۔اتنی سخت صبح و شام کی مشقت کے بعد اس نے گھریلو معاملات کو خود ہی سنبھالنا ہوتا ہے۔عورت صنف نازک ہونے کے باوجود ہر وہ کام کرتی ہے جو مرد نہیں کر سکتا وہ مرد کے شانہ بشانہ کام کرتی ہے مرد کی تخلیق بھی عورت کی کوکھ سے ہوتی ہے۔لیکن مرد کی طرح منفرد حیثیت حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ وہ عورت ہے۔

کشور ناہید نے اپنی آپ بیتی میں تاریخی حالات و واقعات کو موضوع بناتے ہوئے عورت کے دکھ درد اور کیفیت کو بیان کیا ہوا ہے۔"یوسف نے ہر نوکری میں ہر کس و ناکس طریقے سے خوب پیسہ بنایا اور پھر نوکری کے لیے میرے ساتھ خوشگوار تعلقات کرنے کے بعد پھر نئی منزل مقصود کی جانب روانہ ہو گیا۔[۵۳]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرد عورت کو صرف کامیابی و کامرانی کے لیے استعمال کرتا ہے اس کا حسن سب کو متاثر کرتا ہے۔اس ڈرامے یا فلم میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ آتے ہیں۔عورت کے کام اور شخصیت کو سراہتے ہوئے دیکھا جائے تو وہ کام جو ذہین مرد سرانجام دیتا ہے وہ عورت انجام دے کر آسانی سے اپنا نام پیدا کر لیتی ہے۔۔۔

ترقی کا زینہ عورت کے بغیر نامکمل ہے اس بات کو سب سمجھتے تو ہیں لیکن عورت کو پھر بھی ہمیشہ مرد سے کمتر اور حقیر سمجھا جاتا ہے۔کشور ناہید نے عورتوں کے حقوق اس سماج کے پیرائے میں بیان کیے ہیں لیکن در حقیقت یہ سارے نظریے اور الزامات آج کی عورت بھی سہ رہی ہے۔

کشور ناہید ایک بلند حوصلہ اور نڈر خاتون ہیں۔ان کی اس آپ بیتی میں جگہ جگہ اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ انفرادیت کی حامل ہیں اور عورت کے حق میں ہمیشہ آواز اٹھاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ان کی شاعری میں تانیثی شعور جابجا ملتا ہے۔

کشور ناہید نے عورت کے حق میں آواز اٹھائی کہ عورت چاہے تو کیا نہیں کر سکتی بلکہ اس کو عملی جامہ بھی پہنایا کہ عورت کمزور نہیں بہادر ہے۔اس میں بھی بہت سی خوبیاں ہیں اگر اسے بھی موقع دیا جائے تو وہ بھی اپنی الگ پہچان بنا سکتی ہے۔

> جب ۱۹۸۱ء میں پندرہ عورتوں کا جلوس نکالا تھا تو یہ جلوس دیکھ کر مجھے ایس ایم ظفر نے کہا تھا یہ پندرہ نہیں پندرہ ہزار عورتوں کا سمبل ہے۔بس پھر کیا تھا۔ایک کے بعد ایک قانون آنے شروع ہوئے، حدود آرڈیننس کے بعد، قانون شہادت آیا کہ عورت کو مارو تو ۵۰ ہزار روپے اور مرد کو مارو

تو دیت ایک لاکھ روپے ہو گی۔ [۵۴]

عورت شعوری طور پر مضبوط ہے وہ کمزور ہونے کے باوجود مرد سے قوت برداشت میں زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کو ماں جیسا رتبہ ملا۔ کشور ناہید نے بھی عورت کو ذاتی شعور سے آشنا کرنے کی کوشش کی کہ عورت ہر مشکل کا سامنا کر سکتی ہے۔ وہ اپنے بچوں کے لیے کما سکتی ہے اپنے بچے پال سکتی ہے اور گھر کی ذمہ داری اٹھا سکتی ہے۔

کشور ناہید نے اپنی تحریروں میں عورت کے حوالے سے معاشرے کا رویہ بار بار بیان کیا ہے۔ جس میں ان کی اپنی زندگی کے مشاہدات اور تجربات بھی شامل ہیں یعنی ان تجربات کے ذریعے سے انھوں نے اس معاشرے کا چہرہ دکھایا ہے۔ اگر ایک طرف عورت کے حقوق، عورت پر روا رکھے جانے والے ظلم، عورت کی آزادی پر بات کی ہے تو دوسری جانب انھوں نے اس معاشرے کی عورت کو یہ سمجھانے کی حتی الامکان کوشش کی ہے کہ عورت پر جو ظلم ہو رہے ہیں وہ انھیں قبول کرنے کی غلطی نہ کرے۔ یعنی ان رویوں کو جو معاشرے کے تخلیق کردہ ہیں ان کو اپنا مقدر سمجھ کر گلے سے نہ لگائیں بلکہ خود کو اس معاشرے کا فعال رکن سمجھتے ہوئے اپنا تشخص بحال رکھیں کہ وہ اس ظلم کو سہنے کے لیے نہیں ہیں نہ ہی وہ دوسرے درجے کی مخلوق ہیں۔ اس رویے سے انھوں نے عورت کو اس کا تشخص برقرار رکھنے اور اپنے بارے میں سوچنے کی تحریک دی۔

یعنی، جو مجھ پر ظلم ہو رہا ہے یا جو میرے حقوق سلب ہو رہے ہیں وہ میرے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے۔ عورت کی تکلیف بھی معانی رکھتی ہے اور اس کا وجود اس کے گھر میں یا معاشرے میں بے بنیاد یا بے وجہ نہیں ہے۔

> تو کیا بھول گئی جون ایلیاء کو، زندگی نے مسکرا کر پوچھا جو کہتے تھے اس حرافہ نے آزادی کی تحریک چلا کر میری بیوی کو گمراہ کیا۔ ارے یہ کون سی انوکھی بات جون بھائی کرتے تھے، ایک زمانے میں جاوید شاہین نے نہیں کہا تھا" یہ تو ستنام محمود کی طرح ہنستی اور باتیں کرتی ہے، اسی کی طرح اکیلی رہنا چاہتی ہے۔" بہت سے ادیبوں نے نہیں کہا تھا، she is a happy widow، اور کیا نہیں کہا گیا۔ [۵۵]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنفہ نے ایک عورت ہونے کے ناطے تمام تر دکھوں کو جھیلا ہے اور انھیں بھی محسوس کیا ہے۔ عورت کے حقوق پر بات کرنے سے طرح طرح کے طعنے سہے ہیں۔ عورت ایک ماں، بہن، بیٹی یا بیوی کے رشتے سے ہٹ کر ایک انفرادی تشخص بھی رکھتی ہے۔

> زندگی کھلکھلا کر ہنس پڑی، "تم کب امتحان میں نہیں تھیں، جب تم اپنا گھر چھوڑ کر جاوید شاہین کے گھر چلی گئی تھی۔ اس وقت امتحان میں نہیں تھیں، یا جب جاوید شاہین کی بیویاں لڑ کر تمھارے گھر آجاتی تھیں اس وقت امتحان میں نہیں پڑتی تھیں، یا پھر زاہد ڈار کے ساتھ ٹی ہاؤس والوں نے جو سکینڈل بنانے کی کوشش کی اس وقت امتحان میں نہیں تھیں۔ وہ تو کسی بھی عورت کے لیے

سیکنڈل کی کوئی حد، کوئی عمر یا کوئی جواز نہیں ہوتا۔ یہ صرف پاکستان میں موقوف نہیں۔ ساری دنیا
اسی حمام میں ایک جیسی ہے۔[۵۶]

یہ اقتباس اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دنیا کے تمام معاشروں میں عورت سے یکساں سلوک روا رکھا جاتا ہے اور اس کے انفرادی تشخص کو بار بار روندا جاتا ہے۔ کشور ناہید نے اس بات کا ادراک کرانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی کہ ایک عورت پہ جیسا بھی ظلم ہو رہا ہے وہ اس سب میں اپنی ذات کو اپنے تشخص کو برقرار رکھے کہ عورت کی ذات بھی اہم ہے اس کا بھی ذاتی تشخص ہے۔

مجموعی طور پر دونوں شاعرات کی آپ بیتیوں میں عورت کی بحثیت فرد شناخت کو قائم رکھنے کا حوالہ بہت شدت سے اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ پیدائش سے لے کر موت تک عورت اپنی بقا اور انفرادیت کی جنگ لڑتی ہے۔ کہیں اس کے اپنے خونی رشتے اس کے وجود سے منکر نظر آتے ہیں تو کہیں سماج کے ٹھیکیدار اس کی شخصیت پر سوالیہ نشان لگاتے نظر آتے ہیں۔ تاہم ان سب رویوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ ہر جگہ اپنے ہونے کا یقین دلاتی نظر آتی ہے۔ دونوں شاعرات نے بحثیت فعال رکن معاشرے میں ہر جگہ اپنی صلاحیتوں کو منوانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہر جگہ ان کے تشخص کو کچلنے والے رویے آڑے آئے ہیں۔ چنانچہ ان رویوں اور انفرادی تشخص کا حوالہ واضح صورت میں ان کی آپ بیتیوں میں ملتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سید ضمیر جعفری، اردو شاعری کی خاتون اول، (مضمون) مطبوعہ: نگار ادا جعفری نمبر، سالنامہ ۱۹۹۸ء، ص ۵۱۔

۲۔ سیمون دی بوار، عورت ایک نفسیاتی مطالعہ (تلخیص و ترجمہ کشور ناہید، ۱۹۸۲ء)، ص ۷۹۔

۳۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۵ء)، ص ۹۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۴۔

۵۔ ایضاً، ص ۲۵۔

۶۔ ایضاً، ص ۲۳۔

۷۔ سیمون دی بوار، عورت ایک نفسیاتی مطالعہ (تلخیص و ترجمہ کشور ناہید، ۱۹۸۲ء)، ص ۴۰۔

۸۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۵ء)، ص ۶۳۔

۹۔ ایضاً، ص ۶۴۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۶۰۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۶۱۔

۱۲۔ ایضاً ص ۱۶۴۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۲۷۔

۱۴۔ افتخار عارف، (پیش لفظ) کشور ناہید: شخصیت و فن، از شاہین مفتی (اسلام آباد: اکادمی ادبیات، ۲۰۰۸ء)، ص ۷۔

۱۵۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز۔ ۲۰۰۸ء)، ص ۲۹۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۲۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۳۔

۱۸۔ ایضاً، ص ۵۴۔

۱۹۔ ایضاً، ص ۵۴۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۶۱۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۷۳۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۷۴۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۷۹۔۸۰۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۰۰۔

۲۵۔ ایضاً ص ۱۰۲۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۰۲۔۱۰۳۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۳۲۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۳۶۔

۲۹۔ شاہین مفتی، کشور ناہید شخصیت و فن (اسلام آباد: اکادمی آف ادبیات، ۲۰۱۹ء)، ص ۱۰۵۔

۳۰۔ کشور ناہید، شناسائیاں رسوائیاں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)، ص ۸۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۸۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۴۰۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۴۰۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۸۱۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۸۲۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۱۱۔

۳۷۔ قاسم یعقوب، تانیثی تھیوری اور اردو نظم، مشمولہ: دبدبان، شمارہ سوم، ماحولیاتی

تنقید مضامین، ۲۰۱۶ء) ص ۳۵۔

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۷۹۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۸۱۔

۴۰۔ ادا جعفری، جو رہی سو بے خبری رہی (کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۵ء)، ص ۶۴۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۹۴۔

۴۲۔ کشور ناہید، بری عورت کی کتھا (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۱۔

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۱۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۴۶۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۳۰۔

۴۶۔ ایضاً، ص ۳۲۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۳۱۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۳۵۔

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۰۳۔

۵۰۔ ایضاً، ص ۷۸۔

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۰۳۔

۵۲۔ ایضاً، ص ۳۵۔

۵۳۔ کشور ناہید، شناسائیاں رسوائیاں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۰۵۔

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۱۹۔

۵۵۔ ایضاً، ص ۱۷۹۔

۵۶۔ ایضاً، ص ۲۱۳۔

باب چہارم:

اردو شاعرات کی آپ بیتیوں میں بطور عورت سماجی رویوں کی پیش کش کا مطالعہ

باب چہارم:

اردو شاعرات کی آپ بیتیوں میں بطور عورت سماجی رویوں کی پیش کش کا مطالعہ

سماجی رویوں سے مراد وہ عادات واطوار یا اخلاقیات ہیں جو بحثیت مجموعی کوئی گروہ، قوم یا کسی خطے کے لوگ اپنا لیتے ہیں۔ یہ رویے مجموعی طور پر پورے نظام زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ معاشرے کا ہر فرد شعوری یا لاشعوری سطح پر ان رویوں کا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔ صنفی تقسیم کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہمارے سماجی رویے عورت اور فرد کے حوالے سے الگ الگ نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ معاشرہ عورت کو کم عقل اور جذباتی تصور کرتا ہے اور اسی بنا پر اس کے بنیادی حقوق سلب کر لئے جاتے ہیں عورت کو کمزور خیال کر کے یہ معاشرہ عورت کی اس کمزوری کو اپنی طاقت کے طور پر استعمال کرتا ہے عورت کو ایک فرد کی حیثیت سے نہیں محض ایک جنس سمجھا جاتا ہے اور پھر اسے تحفظ کا احساس دلانے کے لیے مختلف روپوں میں پیش کیا جاتا ہے مثلاً ماں بہن بیٹی وغیرہ اور ان کی جنس کے تحت معاشرہ اپنی عزت و حیا کا معیار متعین کرتا ہے اور انہیں ان کے بنیادی حقوق سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے ان کے ساتھ غیر منصفانہ برتاؤ کیا جاتا ہے۔

جو رہی سو بے خبری رہی میں سماجی رویوں کا مطالعہ:

ہمارے معاشرے میں مرد کو اپنی زندگی گزارنے کا پورا حق حاصل ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اسے اپنے کسی بھی فیصلے میں عورت کی رائے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ جس طرح مرد کو اپنی زندگی پر اختیار ہے اسی طرح عورت کا بنیادی حق ہے کہ وہ کیا سوچے اور کیسے زندگی گزارے لیکن عورت سے یہ تمام اختیارات اس کی زندگی میں آنے والا ہر مرد اپنے کنٹرول میں کر لیتا ہے پھر چاہے وہ بھائی ہو، باپ ہو یا شوہر۔ یہ ہمارے معاشرے کا ایک عام سماجی رویہ ہے۔

> اس معاشرے میں مرد کو اپنی زندگی کی ترجیحات پر اختیار حاصل رہا ہے لیکن عورت نے خود اپنی جھلک دیکھنے کے لیے بڑا طویل سفر طے کیا ہے۔[1]

گھر سے باہر جانے کے لیے بھی مردوں کی اجازت ضروری ہوتی ہے۔ جوان بیٹا زندگی کے تمام رنگ دیکھنے کا حق دار ہے لیکن بیٹی اپنے ہر حق سے محروم ہے وہ کسی دربار یا مزار پر بھی نہیں جا سکتی کیونکہ جہاں بھی وہ جائے گی ان کے ساتھ پہرے داروں کا ہونا لازمی ہے۔ ادا جعفری لکھتی ہیں:

کبھی کبھی ان مزاروں پر عرس کے موقع پر خواتین گھر کے مردوں سے چھپ کر چادریں اوڑھ اور ملازموں کے ساتھ جاتی تھیں لڑکیاں بالیاں ایسے پر ہجوم مقامات پر جائیں اس کا تو تصور ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔[۲]

ہمارے سماج میں عورتوں پر طرح طرح کی پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ اگر عورت کے ساتھ زیادتی ہو تو بھی مجرم عورت کو ہی قرار دیا جاتا ہے۔ اگر گھر سے باہر کوئی مرد ان کے ساتھ بد تمیزی کرتا ہے تو عورت کے گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگادی جاتی ہے۔ اگر عورت انصاف کی بات کرے تو اسے باغی اور بے حیا کے القابات سے نوازا جاتا ہے ۔جب تک مردوں کی سوچ اس زاویے سے نہیں نکلے گی کہ ان کی عزت و غیرت کا معیار صرف عورت ہے ان کا اپنا اخلاقی کردار کوئی اہمیت نہیں رکھتا تب تک اس سماج میں عورت کے ساتھ ایسے ہی ناانصافی ہوتی رہے گی۔

اس کے شوہر کی بد سلوکی کا تذکرہ اس میں کہیں بھی نہیں ہوتا تھا۔ اگر امی پوچھ ہی لیتیں کہ یہ چوٹ کیسے آئی تو بڑی صفائی سے گھڑونچی کے پاس پاؤں پھسل جانے یا اندھیرے میں کسی پتھر سے ٹھوکر لگنے کی داستان سنانے لگتی۔[۳]

وہ مزید لکھتی ہیں:

خود کوئی کام کرنے اور کمانے سے کہیں زیادہ آسان بیوی کی نوکری تھی۔[۴]

عورت چونکہ جسمانی طور پر کمزور ہے اور مرد کے ہم پلہ نہیں ہے اس لئے عورت کو ہمیشہ ہی ظلم کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور سب سے بڑھ کر ادا جعفری عورت کی بے بسی اور خاموشی کا تذکرہ کرتی ہیں کہ عورت خود پر ہونے والی ہر زیادتی بڑی خاموشی سے برداشت کرتی رہتی ہے۔ کسی کو یہ احساس تک نہیں ہونے دیتی کہ وہ کس کرب سے گزر رہی ہے۔ عورت خوب صورت پڑھی لکھی ہو اور ملازمت پیشہ بھی تو مرد کی قسمت چمک جاتی ہے ایسے مرد ہاتھ پاؤں ہلانے کے بجائے بیوی کی کمائی پر فخر کرتے ہیں۔

ادا جعفری نے عورت کے ساتھ پیش آنے والے رویوں کو بہت گہرائی سے پرکھا ہے۔ ہمارے سماج کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ مرد خود بھلے پڑھا لکھا نہ ہو مگر بیوی اسے پڑھی لکھی ہی چاہیے تاکہ وہ خود آرام پرستی میں زندگی گزارے اور عورت گھر کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ معاشی ذمہ داری بھی اٹھائے۔ درحقیقت عورت کا استحصال ہر طرح سے ہی کیا جاتا ہے۔

ہمارے سماج میں کچھ ایسے معتبر خاندان بھی ہیں جو اپنے عزت و غیرت کا معیار صرف عورت ہی کو گردانتے ہیں اور اسی غیرت کے پیش نظر عورت پر پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ خاندان میں روایات کا تحفظ عورت کے کنٹرول ہی سے کیا جاتا ہے اور طرح طرح کی پابندیاں عائد کرنا جائز سمجھا جاتا ہے۔ لڑکی کے اسکول جانے سے لے کر اس کی شادی

اور شادی کے بعد بچوں کے بارے میں فیصلے کرنے کا اختیار صرف مردوں ہی کو حاصل ہے اور یہ حق اسی سماج نے مردوں کو دے رکھا ہے۔

ادا جعفری اسی حوالے سے لکھتی ہیں۔"جو خاندان خود اپنی نگاہوں میں جتنا زیادہ معتبر تھا خواتین پر اتنی زیادہ پابندیاں تھیں۔"[۵]

لیکن اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جہاں زیادہ سختی کا ماحول ہوتا ہے بغاوت بھی وہیں جنم لیتی ہے۔

ادا جعفری نے اپنی آپ بیتی میں سیاسی حالات کا ذکر تو نہیں کیا مگر تقسیم ہند کے وقت عورتوں پر ہونے والے مظالم کا ذکر ضرور کیا ہے اور اس سماجی رویے کی نشاندہی کی جو نا قابل بیان حد تک دردناک ہے۔ قیام پاکستان کے دوران جتنی اذیتیں اور مصیبتیں عورتوں نے سہی اتنی کسی اور کے حصے میں نہیں آئیں۔ عورتوں نے اپنی عزتیں بھی گنوائیں اور خونی رشتوں سے لاتعلقی کے صدمے بھی جھیلے۔ انہوں نے ان گناہوں کا کفارہ ادا کیا جو انہوں نے اپنی مرضی سے نہیں کیے تھے۔

> قیام پاکستان کے کچھ عرصے کے بعد فسادات میں اغوا ہونے والی بدنصیب بیٹیوں کی بازیابی کا سلسلہ شروع ہوا تو حساس دلوں نے کچھ صدمے اور سہے۔ دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ غیروں کے ہاتھوں زخموں سے چور چور نڈھال معصومیت کو ایک آخری زخم بھی نصیب ہوا اور یہ آخری بھرپور وار کرنے والے ہاتھ اپنوں کے تھے۔
>
> اس ہجوم میں سب نابینا نہ سہی مگر ایسے ماں باپ بھی سامنے آئے جن کی آنکھیں اپنی مجبور اور مظلوم بیٹی کی پہچان سے عاری ہوئیں۔ جو اس تار تار آنچل کا بوجھ اٹھانے پر محبت اور شفقت کے کسی رشتے کو آمادہ نہیں کر سکے جب بے بسی گناہ بن گئی اور بے کسی کفارہ نہ بن سکی۔[۶]

ادا جعفری نے سماج کے اس رویے کی نشاندہی کی ہے جو شاید ازل سے آج تک ایک جیسا چلا آرہا ہے. جہاں عورتوں کے ساتھ ہونے والے عصمت دری کے واقعات میں ہمیشہ عورت کو قصوروار اور مجرم سمجھا جاتا ہے اور اس ناانصافی میں سب سے بڑا اور گہرا صدمہ اپنوں کی بے رخی اور نفرت آمیز رویوں کا سامنا کرنا ہے۔ اسی لیے بیٹی کی پیدائش پر اداسی اور غم کا سا ماحول ہوتا ہے۔ کیونکہ مرد کی نظر میں بیٹی کی پیدائش اسے کمزور کر دیتی ہے۔ ادا جعفری نے عورت کے ساتھ معاشرے کے رویے کو بہتر اور جامع انداز میں بیان کیا ہے اور اس کے خلاف ایک انفرادی سوچ کا بھی اظہار کیا ہے۔

ہمارے معاشرے نے عورت کہ لیے کچھ اصول و قواعد متعین کیے ہیں جن پر پورا اتر کر ہی وہ ایک عزت دار فرد کی حیثیت سے معاشرے میں زندگی گزار سکتی ہے۔ اگر عورت ان تمام معیارات پر پورا اترتی ہے تو ہی وہ ایک

قابل احترام خاتون ہے لیکن اگر وہ ان سب اصولوں سے ذرا سی بھی کوتاہی برتتی ہے تو اسے اس دائرہ کار سے خارج کر دیا جاتا ہے اور باغی کا خطاب دیا جاتا ہے۔ ادا جعفری بھی اپنی اس آپ بیتی میں اسی سماجی رویے کا ذکر کر رہی ہیں۔

> عورت ایک ہی مہلت حیات میں کئی جیون جھیلتی ہے۔ قلم ہاتھ میں تھام لے تو جھمیلے کچھ اور بڑھ جاتے ہیں۔ زندگی بسر کرنے کے آداب کچھ کہتے ہیں۔ اپنے آپ سے ملنے کے راستے کہیں اور سے نکلتے ہیں۔[۷]

ادا جعفری یہاں معاشرے کے رسم و رواج میں جکڑی ہوئی عورت کا ذکر کر رہی ہیں کہ عورت اپنی زندگی میں اپنی ذات کے علاوہ خود سے وابستہ ہر رشتے کی ذمہ داری کو پورا کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہے۔ ایسے میں اگر وہ اپنی خواہش کی تکمیل چاہتی ہے تو اس کی مشکلات میں مزید اضافہ ہی ہوتا ہے۔ کوئی اس کی دادرسی نہیں کرتا بلکہ ہر ایک اپنے ہی پیمانے میں اسے پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کبھی اپنی ذات کے لیے سوچنے اور وقت نکالنے کے بعد اس کے کسی فرض میں جو کہ سماج نے اس کے لیے متعین کر رکھے ہیں کوئی کوتاہی ہو جائے تو اسے اس کا طعنہ کئی بار سننا پڑتا ہے۔

عورت اگر اپنے جذبات و احساسات اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کرتی ہے۔ تو سماج اسے قابل قبول نہیں سمجھتا بلکہ عورت کی مشکلات میں مزید اضافہ ہی کیا جاتا ہے۔ بالآخر عورت کو ہی اپنی سوچ اور صلاحیتوں کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ تب جا کر وہ اس سماج میں ایک اچھی بیٹی، بیوی اور ماں بننے کے قابل سمجھی جاتی ہے۔

> کالج کے پورے احاطے میں گیارہ مالی کام کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی ہمارے لان میں ہر وقت موجود ہوتا اور میں سویرے سویرے وہاں اس میں بھیگی گھاس پر ننگے پاؤں بکھرے بالوں گھومنا چاہتی میرا یہ گھر کے آداب رہائش کے خلاف تھا مجھے یوں دیکھ کر اجنبی آنکھوں میں ایسا استعجاب ہوتا جس کی تاب لانا دشوار ہو جاتا۔[۸]

ادا جعفری لکھتی ہیں کہ اگر عورت اس معاشرے میں اپنی مرضی سے کھل کر سانس لینا چاہے تو وہ بھی نہیں لے سکتی کیونکہ وہ ایک عورت ہے اس لیے اس کے لیے ایسا کرنا اخلاقیات سے گرا ہوا شمار کیا جاتا ہے اس کے برعکس مرد جہاں جانا چاہیے اپنی مرضی سے جا سکتا ہے گھوم سکتا لیکن عورت جب بھی کچھ ایسا کرنے کا سوچے بھی تو اسے مردوں کی نظریں اپنے وجود کے اندر دھنستی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اسے اپنی سوچ اور اپنی خواہشات کو اس معاشرے کے مردوں کے ڈر سے اپنے ہی اندر دبانا پڑتا ہے کیونکہ یہ معاشرہ مردوں کا ہے اور اس معاشرے میں مردوں کو ہر کام کرنے کی کھلی آزادی ہے اور تمام حدود اور فرائض عورت ہی کے ذمہ لگائے گئے ہیں۔ "سو برس پہلے امریکی معاشرے میں بھی عمر رسیدہ کنواری عورت چبھتی ہوئی نگاہوں کی زد میں رہتی تھی۔"[۹]

ادا جعفری نے اپنی زندگی میں بہت سی جگہوں پر قیام کیا اور مختلف شہروں اور ملکوں کا دورہ کیا اور سماج کے رویوں کو جو خاص کر عورت سے متعلق تھے بہت قریب سے دیکھا اور ان کو پرکھا عورت ہر جگہ ہی مردوں کی نگاہوں کا نشانہ بنتی ہے اور غیر محفوظ ہوتی ہے۔ مردوں کی ایسی نظریں عورت کو اس حد تک کمزور کر دیتی ہیں کہ کچھ خواتین مردوں کے ڈر سے گھر سے نکلنا تک ترک کر دیتی ہیں۔ مرد اپنی نگاہوں کی حفاظت کی بجائے یہ چاہتا ہے کہ عورت ہی سات پردوں میں سمٹ کر رہے مگر پھر بھی اسے جینے نہیں دیا جاتا۔ یہ وہی معاشرہ اور مرد ہیں جو عورت کو اس کی حدود و قیود بتاتے ہیں لیکن جب وہ اپنے حق کے لیے آواز اٹھاتی ہیں تو باغی قرار دیتے ہیں یہ ہر معاشرے کا المیہ ہے۔

> ان دونوں خواتین کا تعلق میرے اپنے قبیلے سے ہے وہ مغربی معاشرہ تھا اور اپنا اپنا ردعمل میرے دیس میں تو مدتوں پہلی سانس لینے سے قبل بھی عورت زندگی سے دستبردار ہونے پر مجبور ہوتی رہی ہے۔[10]

ادا جعفری اپنی آپ بیتی میں صدیوں سے عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور ظلم پر بات کر رہی ہیں کہ عورت کے ساتھ ہر معاشرے کا رویہ ہی بہت دردناک رہا ہے۔ ہر معاشرے نے ایک کمزور پر ظلم کرنا چاہا ہے۔ پہلے وقتوں میں بیٹی کی پیدائش معیوب سمجھی جاتی تھی ۔ مرد اپنے آپ کو ایک بیٹی کا باپ ہونا گالی سمجھتا تھا اس لیے بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیا جاتا۔

اسلام کے ظہور سے قبل عورتوں کے ساتھ جو سلوک ہوتا تھا اس کے بارے میں ڈاکٹر عصمت جمیل اپنے مقالے میں رقمطراز ہیں:

> یہودی گھرانے میں پیسے، جائیداد یا غلاموں کی طرح عورتیں بھی ورثے میں ملنے والی اشیاء کا حصہ ہوتی تھیں۔ بیٹی کو جائیداد میں سے ایک دھیلا نہ ملتا تھا۔ سوائے اس کے کہ کوئی مرد وارث نہ ہو۔ لیکن شادی کے بعد وہ اپنی جائیداد پر تصرف نہ رکھ سکتی تھی۔ جو کچھ ملتا شوہر کو منتقل ہو جاتا۔[11]

ادا جعفری نے بھی اپنی ہم عصر خواتین کی طرح اپنی تحریروں اور شاعری میں عورت کے متعلق لکھا ہے۔ ان کے معاشرے کی عورت اور پھر معاشرے کا مثبت یا منفی پہلو عورت کے معاملے میں کس طرح کے ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ پھر چاہے عورت کے حقوق ہوں یا اس کی گزارشات یا اس کی خواہشات ان کو کس میزان پر پرکھا جاتا ہے یا انھیں کیا درجہ ملتا ہے۔ ان کی آپ بیتی میں بھی ہمیں کہیں نہ کہیں اس کی جھلک ملتی ہے۔ ہمارے معاشرے کا عورت کے حوالے سے کیسا ذہن بن گیا ہے۔ جب کہ ادا جعفری اپنے سماج میں لکھ رہی تھیں اس وقت کا سماج کیسی سوچ رکھتا تھا خاص طور پہ عورت کے حوالے سے کیسا دوہرا رویہ رکھنے کا حامل معاشرہ ہے۔

ادا جعفری اپنی آپ بیتی میں ایک جگہ ایک عورت کا قصہ بیان کرتی ہیں کہ وہ نیک خاتون ہیں جو اپنے خاوند کی

وفات کے بعد ایسی ہو گئی کہ گھر سے باہر نہ نکلتی تھی لوگ اس سے دعائیں کروانے آیا کرتے۔ وہ مکمل طور پر ایک اللہ والی بن گئی تھی۔ اس نے اپنے بچوں کی شادی کروائی اس کی ایک بہو اچانک ایک رات کو اپنے خاوند کی وفات کے بعد غائب ہو جاتی ہے لیکن پھر کچھ دن بعد وہ واپس گھر لوٹ آتی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> اس کی واپسی کی خبر جب محلے میں پہنچی تو لوگوں کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ رسم و رواج کے پابند اور روایت پسند ماحول میں ایک جہاں دیدہ عورت سے کسی کو اس فیصلے کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ اس شریف گھرانے بلکہ اس پورے محلے میں اس کا وجود ناقابل برداشت تھا۔ اب وہاں اس کے لیے کوئی ٹھکانہ کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اعتراض، اختلاف اور پھر شدید رنج والم کی تکرار بھی۔ [12]

یعنی وہ عورت سیدانی بی کی بہو تھی اور کہیں چلی گئی تھی مگر واپس بھی آ گئی تھی۔ لیکن اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے واپس آ جانے پر اس کی غلطی کو معاف نہیں کیا گیا تھا اور بہت مشکلوں کے بعد سیدانی بی نے محلے والوں کی زبانیں بند کروائیں۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عورت اگر کبھی گھر سے نکلنے کی ناقابل معافی غلطی کی مرتکب ہو جاتی ہے اور اسے یہ احساس ہو بھی جائے کہ میں نے غلط کر دیا ہے تو وہ گھر واپس لوٹ آئے گی اپنی غلطی کا اعتراف کر بھی لے گی تو اسے ساری عمر سماج طعنے دیتا رہتا ہے۔

اس کے برعکس کہیں بھی کوئی مرد اگر ایسی حرکت کرتا ہے جیسے کہ وہ نشے کا شکار ہو جاتا ہے یا ایسی کوئی بڑی غلطی سرزد کر لیتا ہے تو دو چار باتوں کے بعد یہ کہہ کر بات ختم کر دی جاتی ہے کہ کوئی بات نہیں مرد ہے۔ اسے معاف کر دیا جاتا ہے لیکن عورت کے لیے معافی کی کوئی گنجائش نہیں یہ معافی صرف مرد کے لیے ہے۔

عورت کے معاملے میں یہ دوہرا رویہ رکھنے والا سماج جس کو ادا جعفری نے کہیں کہیں اپنی آپ بیتی میں بے نقاب کیا ہے۔ ان کے معاشرے میں عورت کو اس کے حقوق سے محروم رکھا جاتا رہا یا پھر کیسے اسے نفسیاتی طور پہ اذیت دی جاتی رہی ہے۔ اس اقتباس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ یہ مردوں کا معاشرہ ہے جہاں عورت کے لیے سماجی رویے منافقت کے بوجھ تلے دب چکے ہیں۔ اس کی بات نہیں سنی جاتی، اس کو بولنے کا موقع نہیں دیا جاتا اور وہ اپنی خواہش کا اظہار کرنا گناہ سمجھتی ہے۔

ادا جعفری اور ان کی ہم عصر خواتین نے اپنی تحریروں میں اس منافقت سے پردہ اٹھانے کی ہمیشہ کوشش جاری رکھی ہے۔ کہیں تو مصنفہ کی اپنی زندگی کا حال اس چیز کو سامنے لاتا ہے اور کہیں مشاہدات سے اس معاشرے کے دوہرے پن کے پردے اٹھتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس سماج پر عورت کا وجود، اس کا تشخص بھی بعض اوقات گراں گزرتا ہے کہ وہ عورت کے معاملے میں دوہرا پن رکھنے کا حامی معاشرہ ہے۔ جس میں عورت کو معافی نہیں دی جاتی بلکہ اس کی ذرا سی غلطی اس کی زندگی بھر کی سزا بن جاتی ہے۔ اسے ذہنی، نفسیاتی، جسمانی اذیتیں دی جاتی ہیں۔ مگر مرد کے معاملے

میں اس سماج نے ہمیشہ اس کی غلطی کو اوّل تو چھپانے کی کوشش کی ہے اور اگر چھپ نہیں سکی تو رفع دفع کر دیا گیا ہے۔ یہ ہے وہ سماج جہاں عورت مرد کی برابری کی صرف بات ہی کی جاتی رہی ہے۔

ادا جعفری محض ایک نسوانی لہجہ نہیں ہے بلکہ وہ ذاتی اور نجی مسائل کو مجموعی انسانی مسائل کی طرح سے ایک فرد کے طور پر دیکھتی ہیں۔ ان کی شاعری میں سماجی حالات و واقعات کا بیان ملتا ہے۔ ادا جعفری نے خاتون کی حیثیت سے نسائیت کے بعض ایسے نفسیاتی مسائل کو بیان کیا ہے جو خواتین کو درپیش تھے۔

> ان خواتین کی شاعری اپنے زمانے کے لحاظ سے خاصی اہمیت رکھتی ہے مگر اس دور میں خواتین کو آزادانہ اظہار خیال کا موقع نہیں دیا گیا۔ ابھی تک ان کے سامنے رکاوٹیں بھی تھیں ،اندیشے بھی تھے یہی وجہ ہے یہ شاعری اپنی کوئی پہچان پیش کرنے سے قاصر رہی۔ [۱۳]

ادا جعفری نے اپنے دور کے حالات و واقعات کی عکاسی کی ہے کہ کس طرح عورت کی ترقی میں رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں کیونکہ وہ ایک عورت ہے اور ایک عورت کی حیثیت سے شاعری نہیں کر سکتی۔ اپنی تحریر کو چھپوانے کے لیے اپنا نام تک ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ سماج کو یہ کبھی قبول نہیں کہ عورت مرد سے آگے نکلے۔ اگر مرد شادی کر سکتا ہے تو عورت کیوں نہیں؟ صرف عورت پر کیوں پابندی لگائی جاتی ہے جبکہ مرد جو مرضی کرتا پھرے وہ کسی کے آگے جواب دہ نہیں ہے۔ مرد صرف عورت پر پابندیاں لگا کر اپنا تسلط اپنی حکمرانی قائم کرنا چاہتا ہے۔

> مجھے احساس ہے کہ مردوں کے اس معاشرے میں جہاں عورت کی اپنی کوئی حقیقت ہی نہیں تھی، میرا احتجاج بھی بلند آہنگ نہیں تھا۔ اسے احتجاج کہوں بھی یا نہیں۔ بہر حال اسے نسل در نسل منتقل ہونے والی فرسودہ روایات سے انحراف یقیناً کہا جا سکتا ہے۔ [۱۴]

ادا جعفری کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ ہمارے اس مردوں کے معاشرے میں عورت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ یہ روایت بھی صدیوں سے چلی آ رہی ہے چنانچہ وہ اس سے انکار کرنا چاہتی ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں نسائیت کی نمائندگی کھل کر کی۔ وہ بھی چاہتی تھیں کہ عورت کو اس کا اصل مقام ملے اس معاشرے میں عورت کو بھی وہی عزت و مرتبہ ملے جو مرد کو حاصل ہے۔

> میں نے عورت کو مجبوری اور محکومی کی زندگی بسر کرتے دیکھا تھا اور اور اس دکھ کو سہا بھی تھا میری شاعری اس دکھ کے نام تھی۔ [۱۵]

بری عورت کی کتھا میں سماجی شعور کا مطالعہ:

کوئی بھی ملک یا معاشرہ ہو عورت سے شادی کے معاملے میں بھی اس کی مرضی معلوم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ شادی کی تیاریوں سے لے کر ہر چھوٹی بڑی بات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ مگر جس کی زندگی کا فیصلہ

ہو رہا ہوتا ہے۔اس کی مرضی اور خوشی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ایسی ہی ایک مجبور عورت اٹلی کی ماریہ تھی۔کشور ناہید کے دکھ کو اسی کی زبانی یوں بیان کرتی ہیں۔

> اٹلی میں ویلنیسٹن خاندان کی ماریہ بولی"لوگ کہتے ہیں۔کومو جھیل گلیشئر سے نکلتی ہے۔ سینکڑوں دیہات اور ہزاروں لوگ اس کے کنارے آباد ہیں، کون جانے جھیل میں کس کا کلیجہ عرق عرق ہوا۔مجھے تو میلانو کے ۴۸ سالہ شہزادے سے بیاہ دیا گیا تھا۔کسی کو میری ۲۰ سالہ جوانی نظر نہیں آئی تھی۔سب کو وہ دولت اور طویل و عریض عمارت نظر آئی تھی۔جو آج تک شربولانی ولا کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔[۱۶]

یہ بھی ہمارے معاشرے کا ایک نظریہ ہے کہ جب لڑکی کی شادی کی جاتی ہے تو عمر کے فرق کو دیکھنے کی بجائے لڑکے کی دولت اور گھر دیکھا جاتا ہے۔یہ المیہ نا صرف برصغیر کے معاشرے میں پایا جاتا ہے بلکہ ہر سماج اور خاندان کی یہی کہانی ہے۔ان کے خیال میں عورت کی خوشی صرف دولت اور عیش و عشرت میں ہے۔

کشور ناہید نے جہاں معاشرے کے منافقانہ چہرے کو بے نقاب کیا ہے وہیں عورت کو شعور ذات بھی سکھایا ہے اور خود اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر سوال اٹھایا ہے۔

> مجھے غصے میں بڑبڑانے کی عادت ہمیشہ سے تھی۔میں گھر پر بھی بھائیوں کے فقرے سنوں بلبلاؤں۔بھلا عورت کیوں شعر کہہ سکتی ہے مگر کسی کے سامنے اپنے غصے کا اظہار بھی نہیں کر سکتی تھی۔[۱۷]

ایک اور جگہ کشور ناہید بچپن کے حالات بیان کرتے ہوئے کہتی ہے:

> مجھے یاد آیا کہ ایک زمانے میں میری حرکتوں سے تنگ آ کر اماں نے مجھے کسی بی بی کے پاس قرآن ختم کرنے کے لیے بٹھا دیا ان کا گھر کچھ دور گلی کے نکڑ پر تھا۔وہ بی بی پہلے تو اپنے گھر کے برتن دھلواتیں، یا گھر میں جھاڑو دلواتیں، آٹا گندھواتیں، اور کہتیں "حضرت بی بی فاطمہ سارے کام اپنے ہاتھ سے کرتی تھی۔تم کو بھی عادت پڑے گی تو سکھی رہو گی۔""میں سپارہ سامنے رکھے بڑبڑانے لگتی "کیا مصیبت ہے گھر میں اماں مصالحہ پسواتی ہیں اور ہاتھوں میں مرچیں لگتی ہیں بوا جھاڑو دلواتی ہیں اور چنا ہوا دوپٹہ گندا ہوتا ہے۔[۱۸]

کشور ناہید شروع سے ہی سماج کے خلاف آواز اٹھانے کی عادی تھیں۔بچپن سے جوانی تک ان کا یہ رویہ اور آواز مضبوط دلائل کے ساتھ بلند ہوتی گئی اور انہوں نے عورت کو اس کا شعور ذات دینے اور معاشرے میں اس کی انفرادی حیثیت منوانے میں ہمیشہ قلم سے جہاد کیا۔

> لوگ فرعون کے زمانے کی عبرتیں سناتے ہیں اس سے تو اسلام سے پہلے کا زمانہ کہا جاتا ہے۔اسلام

نافذ کرنے والوں اور شرعی عدالتوں نے تو یہ بھی کہہ دیا ہے کہ بلوچستان کی ۱۳ سالہ بچی باپ کی زیادتی کی شکایت ماموں کے اکسانے پر کر رہی ہے۔ ماموں بچی کے حصے کی جائیداد پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں۔۔۔۔ میں سن رہی ہوں۔[۱۹]

ایک اور جگہ کشور ناہید صاحبہ لکھتی ہیں کہ ہمیں نہ صرف طرح طرح کی پابندیوں کا سامنا رہتا ہے بلکہ پڑھنے کی کتابوں کا تعین بھی ہم اپنی منشا سے نہیں کر سکتی تھیں۔

جب میں نے کتاب لے جا کر بھائی سے پوچھا اس میں کیا ہے جس پر مقدمہ چل رہا ہے۔ میں نے کئی بار پڑھا مجھے پتا نہیں چل رہا۔ تڑاخ سے میرے منہ پر تھپڑ اور کتاب ہاتھ سے چھین لی گئی تھی۔ کس کس کی کتاب ہاتھ سے نہیں چھینی گئی۔ بچپن میں گھر والوں نے اور بڑے ہو کر سرکاروں نے مگر ملال کی کون سی بات اپنی تاریخ کو دیکھو۔ چوراہوں پر کتابیں جلانے کے ورق تمہارا ہی ورثہ ہیں۔[۲۰]

ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشور ناہید سماج کے اس تلخ رویے پر طنز کرتی نظر آ رہی ہیں کہ بچپن میں گھر والوں نے کتاب چھین لی اور جوانی میں جب میں نے اپنی کتابیں لکھیں تو انہیں بین کر دیا گیا یا جو کتابیں پڑھی تھیں وہ بین کر دی گئیں۔ کتابیں چھیننے کا یہ رویہ ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے۔ ہمیں کون سی کتاب پڑھنی ہے اور کون سے نہیں اس بات کا تعین بھی مردوں نے ہی کرنا ہے۔ کشور ناہید صدائے بغاوت بلند کرتی نظر آتی ہیں کہ عورت پر سماج کی پابندیاں لامحدود ہیں۔

مجھ سے میرے ایک لبنانی دوست نے پوچھا "خنا کی شاعری پڑھی ہے۔" میں نے کہا ہاں جہاں تک دستیاب ہوئی "اس نے کہا" اور دور جاہلیہ کی شاعری" میں نے کہا" میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی "لبنانی دوست نے کہا" اصل علم اور اصل شاعری تو اس وقت تھی "ہمیں تو سکول کے نصاب میں وہ شاعری پڑھائی گئی ہے۔ مگر ہمیں تو مذہب کے نام پر بہشتی زیور' پکی روٹی اور کاما سوترا جیسی کتابیں جائز' علم کے دروازے بند! اور دور جاہلیہ کی شاعری نامنظور ![۲۱]

اس پیرے میں بھی کشور ناہید کتابوں کی پابندی پر صدائے احتجاج اور اختلاف رائے رکھتی نظر آتی ہیں کہ صرف گھر یا باہر ہی کتابوں کی پابندی نہیں تھی بلکہ نصابی سطح کی کتابوں میں بھی پابندیاں عائد تھیں۔ مذہب کے نام پر بھی بہشتی زیور سے آگے کچھ سوچنے کی اجازت نہیں تھی اور نہ ہی دوسری مذہبی کتابیں جائز تھیں۔ غرض یہ کہ اس آپ بیتی میں جگہ جگہ کشور ناہید زمانے کے رواج کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے ذاتی رویے کا اظہار کرتی نظر آتی ہیں کہ عورت کو معاشرے کے فرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ جنس کی حیثیت سے جانچا جاتا

ہے۔مذہب اور قانون دونوں عورت کو برابری کے حقوق دیتے ہیں۔مگر معاشرہ انہیں تسلیم نہیں کرتا عورت کی قابلیت کو پس پشت ڈال کر ہمیشہ اپنی نامعلوم غیرت کو اس کی قابلیت پر ترجیح دی جاتی ہے۔مرد عورت کو ہی اپنی عزت، غیرت اور حیا کا معیار بنا کر خود ہر طرح سے آزادی کی زندگی بسر کرتا ہے کشور ناہید اس حوالے سے رقمطراز ہیں۔

> لکھنا ختم کر کے چشمہ اتارا۔بیٹھ کر کہنے لگے "بیٹا! یہ مشاعرے وشاعرے پڑھنے کا شوق پورا ہو چکا ہے۔کالج میں خوب نام کمالیا ہے خوب کپ بھی اکٹھے کر لئے ہیں۔اب میری مانو۔۔۔جس سے تم نے یہ غزلیں لی تھیں۔اس کو واپس کر دو تمہارے گھر میں کوئی اتنا حد سے آگے نہیں بڑھا۔جتنی تم ۔۔۔دیکھا ہے اپنی بڑی بہنوں کو۔۔۔تمہاری اماں کے ہاتھ بات گئی تو اور بھی برا ہو گا۔اس لئے میرا کہا مانو اور اب یہ ڈراما بند کر دو۔"[۲۲]

عورت کو اس کی انفرادیت کی بنا پر پرکھنے کی بجائے ایک ہی ریوڑ کی بکریوں کی طرح ہانکے رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔اس کی انفرادی سوچ یا کوئی بھی تخلیقی صلاحیت کسی کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہے۔کشور ناہید اپنی اس آپ بیتی کے ذریعے معاشرے کا نامنصفانہ رویہ ہمارے سامنے پیش کر رہی ہیں۔جس معاشرے میں وہ پروان چڑھ رہی تھیں اس میں عورت اور خاص طور پر پھر ایک سید گھرانے کی عورت کو کس طرح کے حالات وواقعات کا سامنا تھا ہمارے معاشرے نے ہمیشہ سے ہی بے وجہ حدود وقید متعین کر کے عورت کی زندگی کو مشکل سے مشکل تر بنانے کی کوشش کی ہے۔

کشور ناہید ایک جگہ اپنی ماں کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں:

> مگر یہ ساری شیخی یونیورسٹی کے احاطے تک ہی تھی کہ یہ گھر آتے ہی مباحثے میں یا مشاعرے میں جیتے ہوئے کپ آٹے کے کنستر یا کوڑے کے ڈبے میں چھپا کر عزت بچانی ہوتی تھی 'ورنہ کپ دیکھتے ہی واویلا ہوتا تھا کہ "آگئی خاندان بھر کا نام اچھال کر' مجھے پتہ ہوتا ایسی اٹھے گی تو پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیتی۔"[۲۳]

کشور ناہید چونکہ ایک قدامت پسند سید گھرانے میں پیدا ہوئیں اور یہ معاشرہ اور بالخصوص ان کا گھرانا لڑکیوں کی تعلیم کا قائل نہیں تھا۔عورتوں کی تعلیم و تربیت بس اتنی ہی تھی کہ انہیں قرآن، ناظرہ اور بہشتی زیور پڑھا کر اپنے حقوق و فرائض پورے کر دئے جاتے۔ اس سے زیادہ تعلیم پر عورت کو کوئی حق حاصل نہ تھا۔ اپنی خود نوشت میں عورتوں کو روز مرہ در پیش مسائل اور مشکلات کا ذکر کشور نے نہایت جرات مندانہ انداز سے کیا۔

ڈاکٹر ندیم احمد اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

اس خود نوشت میں کشور ناہید نے متوسط طبقے کے مسلم گھرانوں میں عورت کی سماجی حیثیت کا ذکر بڑی بے باکی اور صاف گوئی سے کیا ہے اور اکثر تلخ اور طنزیہ لہجہ اختیار کیا ہے۔ جن صعوبتوں اور پریشانیوں سے عورتوں کو اپنے حقوق پانے کے لیے گزرنا پڑتا ہے ہمارے سماج میں جس طرح سے عورتوں کا استحصال ہوتا رہا ہے اگر ہم اس سبھی صورت حال کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیں تو کشور ناہید کا تلخ رویہ فطری محسوس ہوتا ہے۔ [۲۴]

کشور ناہید نے اس گھٹے ہوئے ماحول میں پرورش پانے کے بعد بھی اپنی زندگی کے تمام فیصلے روایت سے انحراف کرتے ہوئے کیے۔ وہ اس گھٹن زدہ ماحول جس میں عورت کی کوئی قدر و اہمیت نہیں تھی بغاوت کی قائل نظر آتی ہیں کشور ناہید ایک جگہ لکھتی ہیں۔

حلقہ بگوشی کی تمنا پیرہن بدل بدل کر سامنے آتی رہی۔ دوستی، افسری، شاعری، شوہری حتٰی کہ بیٹوں کے بڑے ہونے اور ماں کے قد سے اونچا ہوتے ہی۔ حلقہ بگوش بن جاؤ۔ بس پھر عصمت بھی ہے، حیا بھی ہے، تمیز بھی ہے اور شرافت بھی ہے اور اگر یہ منظور نہیں تو دنیا کا ہر عیب مگرمچھ کے منہ کی طرح کھلا تمہیں ہڑپ کرنے کو موجود ہے۔ صحافی ہو تو ساتھ بیٹھ کر چائے پی لو۔ نہیں تو پیار سے بات کر لو۔ اگر وہ ذاتی شرافت میں سیکنڈل بناڈالے تو پی جاؤ۔ پھر تو نیک بی بی ہو۔ ورنہ پھر ففتھ کالمسٹ ہو، غیر محب وطن ہو اور جو چاہے بن جاؤ۔ [۲۵]

معاشرے نے عورت کی شرافت، تمیز اور حیا کے معیار مرد کی سوچ کے مطابق متعین کر رکھے ہیں۔ اگر وہ اس دائرہ کار پر پوری اترے گی تو اسے حیا، شرافت عزت کا تاج پہنایا جائے گا اور اگر وہ اس کے برعکس اپنی شخصیت کو ابھارنا چاہے تو باغی قرار پائے گی۔ ہمیشہ سے ہی عورت کی بغاوت یا باغی رویے کے سچے حالات واقعات کا جائزہ لیا جائے تو اس معاشرے اور مردوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ جب عورت کو ایک فرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ جنس کے طور پر پرکھا جائے اور مردوں کے مقابلے میں ہر لحاظ سے کم رکھا جائے تو ایسے معاشروں میں کشور ناہید جیسی عورتیں ہی جنم لیتی ہیں۔ جب حق مانگنے سے نہیں ملتا تو انسان اسے چھیننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پھر چاہے اسے کسی بھی حد تک جانا پڑ جائے کشور ناہید کی زندگی بھی ہمیں اسی دائرہ کار میں گھومتی نظر آتی ہے۔ اسی پیرائے میں وہ ایک جگہ کہتی ہیں:

اگر شوہر اعلیٰ افسر ہے تو لکھنے والی سب کی بھابی، بہت اچھی نیک اور سلیقہ شعار ہے۔ اگر شوہر اتنا بڑا افسر نہیں تو اس کی تحریر سے لے کر اس کا کردار تک مشکوک معلوم ہوتا ہے۔ پھر نمبر ملتے ہیں تو خوبصورتی کے لحاظ سے۔ جواب اور منطق یہ کہ دیکھ کر جی تو خوش ہو جاتا ہے۔ [۲۶]

کشور ناہید نے اپنی آپ بیتی میں ان مردوں کے بھیانک چہروں کو بے نقاب کیا ہے جو بظاہر شرافت کا لبادہ اوڑھے معاشرے میں دندناتے پھرتے ہیں اور جہاں عورت کی بات آجائے تو ان کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ ایسے میں

اخلاقیات، شرافت اور حیا کے دائرہ کار بدل جاتے ہیں کیونکہ تب اس معاشرے کی ایک بے بس لاچار و مجبور عورت نہیں بلکہ ایک طاقتور مرد ہوتا ہے۔ وہ جب چاہے ،جو چاہے کر سکتا ہے۔ وہ کسی کو جواب دینے کا پابند نہیں ہوتا اور یہ سرکشی اسے اس مردانہ معاشرے نے دے رکھی ہے۔

کشور ناہید چونکہ ایک حقیقت پسند خاتون ہیں اس لیے وہ اسے مردوں کے چہروں کو بے نقاب کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتیں۔ کشور ناہید کا تعلق ایک سید گھرانے سے تھا سید گھرانوں میں شرعی پردے کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ کشور ناہید کو بھی سات سال کی عمر میں برقعہ پہنا دیا گیا تھا سید گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود جہاں دینی احکام کی پاسداری بڑی وضع کے ساتھ کی جاتی ہے ۔

اس معاشرے میں رہنے کے ساتھ ساتھ دینی احکام کو اپنی مرضی کے ساتھ دوسروں کی زندگیوں پر لاگو کرنا دوسروں کے جذبات واحساسات سے کھلینے کے مترادف ہے۔ صرف اس لئے عورت ذات کی نفی کرنا اور سید زادے نہ ملنے پر ان کی پوری زندگیاں اسی کاوش میں در گور کر دینا دنیا کا کوئی مذہب نہیں سکھاتا۔ ہمارا دین تو پرہیز گاری کا معیار تقوی کو ٹھہراتا ہے پھر چاہے وہ کسی بھی رنگ یا نسل سے تعلق رکھتا ہو لیکن یہ اس معاشرے کے مردوں کی بے رحم سوچ ہے جس کے تحت کئی دوشیزائیں گھر بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو گئیں اور آج تک ہو رہی ہیں۔

> یا اللہ یہ روز روز کیوں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ رشتہ ہو کیوں نہیں جاتا آخر پتہ چلا کہ شریف زادے اور سید زادے چاہیں۔ سیدوں کے خاندان کی لڑکی کو کسی اور ذات میں نہیں دیا جاسکتا تھا۔ پھر مجھے وہ سب بڑی عمر کی خالائیں اور پھوپھیاں یاد آئیں۔ جو گھر بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو گئیں تھیں۔ جو اپنے بدن اور چادروں پر دن رات اپنے ہاتھوں سے کچھ کاڑھتی رہتی تھیں"۔ [۲۷]

غرض کشور ناہید ایک حساس خاتون ہیں جنہوں نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا اور آخر کار قلم اٹھانے پر مجبور ہوئیں۔ ان کی آپ بیتی میں جگہ جگہ عورت ذات کی تذلیل اور غیر منصفانہ رویے ملتے ہیں جس کا اظہار وہ برملا کرتی ہیں اور ان سب رویوں کا ذمہ دار مردوں اور اس معاشرے کو ٹھہراتی ہیں۔

کشور ناہید نے مرد اور عورت کے امتیاز میں وہ اہم نکات بیان کیے ہیں جو تلخ ضرور ہیں لیکن حقیقت کے بہت قریب ہیں۔ جس کی وجہ سے انہیں حقیر نظروں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

> عورت مرد کا کیا مقابلہ۔۔۔ تم کیا میرا مقابلہ کروں گی۔۔۔ کس کی صحبت میں بد عادت پڑی ہے ۔۔۔ کون ہے وہ خوش نصیب۔ سارے ملک میں اشتہار اور ان ترقی پسند کی بھی انگلیاں اٹھ رہی ہیں کہ جو عورت کی برابری کا نعرہ انقلاب کے نام پر مارتے ہیں۔ اخلاق کی ساری ضرورت صرف عورت کو ہے۔ ٹی وی پر مرد جائے تو ہنر مند۔۔۔ عورت جائے تو بد کردار، پبلسٹی کی شوقین کہلائے، ریڈیو پر مرد کو چاہے صرف صدا لگانے کا موقع ملے آبرومندی قرار پائے عورت کو کسی

بھی پروگرام میں کام کرنا۔۔۔۔ عیاشی کا بہانہ کیا جائے۔ مرد کا گاہے بگاہے بے اطلاع شام کو دعوتوں میں جانا ضرورت اور عورت کا اطلاع کے باوجود سرکاری ضیافتوں میں جانا بھی حق زوجیت سے متجاوز ہونے کے مترادف قرار پائے مرد کا بے اطلاع گھر سے غائب رہنا اس کی آزادی کا حصہ۔ عورت کا اطلاع دے کر انفرادی سطح پر کسی کام یا میٹنگ پہ جانا بے لگام آزادی کا نام ٹھہرے۔[۲۸]

اس اقتباس میں مرد اور عورت کے درمیان فرق کو واضح طور پر کشور ناہید نے بیان کیا ہے۔ اس وقت عورت کو اپنے حق میں بولنے کی آزادی نہ تھی۔ کشور ناہید نے ایسے وقت پر عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر قلم اٹھایا اور اس کے حق میں آواز کا بیڑہ اٹھایا۔ لفظوں کے بہترین چناؤ نے کشور ناہید کو خوب عزت بخشی۔ ایک عورت اپنے بارے میں کیا سوچ رکھتی ہے یا ایک عورت خود کو اپنی طرح سے کہاں دیکھتی ہے۔ میں کیا ہوں میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ عورت کی ذاتی پہچان بھی کوئی وجود رکھتی ہے یا نہیں۔ ان سب کا اظہار کی آپ بیتی میں ملتا ہے۔ وہ اپنی شادی کی رات کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

سہاگ رات بھی عجب آشوب رات تھی۔ ہم اکٹھے تھے اک دوسرے سے جیسے چھپ رہے تھے۔ دونوں کو اس ناگہانی سنجوگ پہ اعتبار ہی نہیں آرہا تھا۔ اس کے سونے کے بعد ساری رات سیڑھیوں پر بیٹھی رہی کہ اس کے پاس صرف ڈھائی روپے ہیں زندگی کیسے گزرے گی۔[۲۹]

یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ ایک عورت نے شادی کر کے بھی خود ہی سوچنا ہے کہ اس نے کہاں سے کمانا ہے کہاں سے کھانا ہے۔ ایک عورت ہر جگہ ہر طرح سے ہر انسان کے لیے کھڑی ہے۔ کہاں کس کی کیا ضرورت پوری کر رہی ہے اور معاشرہ اس کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔ اس کی اپنی ذات ہے اس کا بھی کوئی شوق ہے جس کے تحت وہ کچھ کرنا چاہتی ہے۔ عورت کے نزدیک عورت کے ساتھ ہمیشہ معاشرے نے زیادتی کی ہے۔ اس کی اپنی بھی ذات ہے جسے یکسر بھلا دیا گیا ہے۔

کشور ناہید بھی انہی ناانصافیوں پر نالاں نظر آتی ہیں اور انھوں نے اس کے خلاف قلم اٹھایا۔ اسی لیے اپنی آپ بیتی میں ان ناانصافیوں اور ناروا سلوک کے خلاف جگہ جگہ بات کرتی نظر آتی ہیں کہ عورت پر ایسی بے جا پابندیاں کیوں لگائی گئی ہیں جو مرد پر نہیں ہیں۔ مرد معاشرے میں اپنی مرضی سے جو چاہے کرتا ہے پھر عورت اپنے حق کے لیے بھی آواز نہ اٹھائے اس میں عورت کا کیا قصور ہے کہ وہ ایک ایسے معاشرے میں پیدا ہوئی جہاں اس کی کوئی قدر و منزلت نہیں۔ جب کہ یہ معاشرہ بھی اس کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کرتا ہے۔

زندگی میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا شعور، وجدان عقل اور کسی بھی فلسفے یا حسیت سے براہ راست تعلق نہ ہو۔ پھر بھی حقیقت سے زیادہ حقیقت کے طور پر مانی جاتی ہیں۔ دلہن تلاش کرنی ہو

تو کہا جاتا ہے کہ لڑکی نہیں لڑکی کی ماں کو دیکھو اس نے آگے جا کر وہی بننا ہے اس لیے تجربے اور مشاہدے کے لئے پہلے ماں کو دیکھو۔[۳۰]

کشور ناہید معاشرے کی اس باریک بینی پر آواز اٹھاتی نظر آتی ہیں کہ آخر عورت کو اس کے اپنے کردار سے کیوں نہیں پہچانا جاتا۔ عورت کی اپنی ایک الگ حیثیت اور پہچان ہے۔ اسے ہمیشہ کسی نہ کسی سہارے کے ساتھ کیوں منسلک کیا جاتا ہے۔ لڑکی دیکھنے سے پہلے اس کی ماں کو دیکھو ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ لڑکے کو دیکھنے سے پہلے اس کے باپ کو دیکھا جائے۔ جیسا باپ ویسا بیٹا۔ ہمارے معاشرے میں ایسا نہیں ہوتا ہمیشہ عورت کے لیے ہی ترازو بنائے گئے ہیں۔ صرف اس کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے اور عورت کو اپنی شناخت کے لیے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اپنی پہچان کے لیے ہزاروں جتن کرنے پڑتے ہیں جب کہ مرد جو مرضی کرتا پھرے صرف اتنا کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ مرد ہے۔

کچھ ایسی کیفیت نے میرے اندر سر اٹھایا۔ میں نے اپنے اندر کی ایک اور زنجیر کاٹ دی۔ اب تو ساری قیامتوں سے بڑھ کر قیامت سامنے تھی" مردوں کا مقابلہ کروں گی "گھر والوں کے علاوہ سارے پرانے دوستوں کی طنزیہ مسکراہٹ نے میرا استقبال کیا۔[۳۱]

کشور ناہید نے سماج کے خلاف آواز اٹھانے کی جو کوشش کی اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ہم صرف بول ہی دیں کے عورت مرد کا مقابلہ کر سکتی ہے تو پھر بھی اس کا تمسخر بنایا جاتا ہے یعنی ہمارے معاشرے کی گھٹی میں یہ بات شامل کی جا چکی ہے کہ عورت اور مرد کا کوئی مقابلہ نہیں۔ مرد ہر لحاظ سے عورت سے بہتر ہے لیکن ایسا ہر گز نہیں کہ عورت مرد کے شانہ بشانہ کام کر سکتی ہے۔ عورت مرد کی طرح مضبوط ہے، وہ اپنے گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کے علاوہ مرد کا ہاتھ بھی بٹا سکتی ہے اور اپنی ایک الگ پہچان بنا سکتی ہے۔ کشور ناہید نے قلم کہ ذریعے عورت کی حیثیت کو منوانے کی کوشش کی ہے کہ عورت بھی اس معاشرے کا حصہ ہے اس کی بھی اپنی ایک الگ ذات ہے جبکہ ہمارا سماج عورت کو اس کا مقام نہیں دیتا اور مردوں کو یہ حق دیتا ہے کے وہ عورتوں کے حقوق کی حق تلفی کرتے رہی ہیں۔ "والٹ وٹمین" نے کہا تھا" خاتون شاگردوں کو استاد سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے سبب یہ ہے کہ معاشرہ۔۔۔۔ عورت کی لغت اور عورت کے نقطہ نظر کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔[۳۲]

یہاں اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ ہر دور میں عورت کو مرد سے آگے بڑھنے سے منع کیا گیا ہے چاہے اس کی صلاحیتیں مرد سے زیادہ ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کے باوجود معاشرہ عورت کو مرد سے آگے قبول نہیں کرتا معاشرہ عورت کی سوچ کو سمجھنے کے لئے تیار نہیں کہ وہ بھی کچھ کر سکتی ہیں وہ بھی مرد سے آگے بڑھ سکتی ہے۔

معاشرے اور مرد نے خود اپنے تئیں فیصلے کر کے فطرت اور قدرت کے نام لگا دیئے ۔ پہلا فیصلہ

یہ تھا کہ عورت کے وجود کا بنیادی مقصد بچہ پیدا کرنا ہے اس کے اندر بچہ دانی اس مقصد کے لئے ہے۔ صحیح کہ اس کے اندر بچہ دانی ہے۔ مگر اس کے اندر ایک دماغ بھی تو ہے۔ [۳۳]

غرض یہ کہ ہمارے معاشرے اور مرد کی یہی سوچ ہے کہ عورت صرف بچہ پیدا کر سکتی ہے اور اس کا صرف یہی مقصد ہے۔ مگر یہ کوئی نہیں سمجھتا کہ اس کا دماغ بھی ہے، وہ بھی شعور رکھتی ہے۔ وہ بھی کچھ کر سکتی ہے اس کی صلاحیتوں کو بھی اجاگر کرنے کا موقع دیا جانا چاہیے۔ کشور ناہید اس آپ بیتی میں معاشرے کی ناانصافی پر احتجاج کرتی نظر آتی ہیں۔ یہ ایک بہت تلخ حقیقت ہے کہ عورت چاہے شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ اس کا کردار ہمیشہ ہی خطرے میں پڑا رہتا ہے۔ معاشرے کی طرف سے لگائی گئی معمولی سی تہمت بھی اس کی زندگی کو برباد کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس کی ساری نیک نامی بدی میں بدلنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا۔ کشور ناہید نے عورت کی معاشرے میں حیثیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی اور معاشرے کے ان سماجی رویوں کو باور کرانے کی کوشش کی جو عورت کی ذات کو ہمیشہ دوسرے درجے کی شے سمجھتے ہیں۔ کسی بھی رشتے یا شخص پر اس کا اختیار نہیں سمجھتے۔ حتی کہ اپنی ذات پر بھی اس کا اختیار معاشرہ طے کرتا ہے۔ کشور ناہید نے اپنے عہد کے اس رویے کا بھی ذکر آپ بیتی میں کیا جہاں عورتوں کے ساتھ ہونے والے جنسی استحصال کو من گھڑت کہانی سمجھا جاتا اور جہاں عورت کو اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی بھی جرات نہیں ہوتی۔

> اندھی صفیہ بی بی نے بھی جب سوال کیا میرے ساتھ زیادتی ہوئی میں حاملہ ہوئی میں زیادتی کرنے والے کا نام نہیں جانتی۔ شرعی عدالت نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا اس کے لیے ۲۰ کوڑوں اور ۱۴ سال کی سزا تجویز کی وہ بھی سزا کاسن کر شرابور ہو گئی تھی۔ زمین اعتبار نہیں کرتی آسماں یقین نہیں کرتا مگر پاکستان میں یہ ہوا۔ [۳۴]

عورت ایک تو مرد کے ظلم کا شکار ہو اور پھر مجرم کو سزا ملنے کے بجائے سزاوار عورت ہی ٹھہرے گی۔ کیوں کہ وہ مجرم کے خلاف مکمل ثبوت نہیں دے سکتی معاشرے کی یہ سنگدلی صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے کردار کی دھجیاں اڑانے میں کوئی کمی فرو گزاشت نہیں کی جاتی۔

> گزشتہ ۱۴ برس میں ۱۹۹۷ء سے ۱۹۹۳ء تک کے شوہروں نے بیویوں کو زنا کے جرم میں جیل بھجوا دیا کہ وہ سکون سے دوسری شادی کر سکیں۔ بھائیوں نے بہنوں پر زنا کا الزام لگایا اور ان کا حق وراثت ہڑپ کر لینے میں مردانگی محسوس کی۔ بیٹیوں کو باپوں نے زنا کا مجرم گردانہ کہ وہ اپنی مرضی کی شادی نا کر سکیں اور باپ وہ زر فروخت حاصل کر سکے جس کے عوض ان کی زندگی میں آسودگی آ سکے۔ [۳۵]

معاشرے کے اس رویے کو صرف عورت کی آواز دبانے کے لیے اپنایا جاتا ہے تاکہ مرد کے برابر حقوق نہ

حاصل کر سکے اور نہ ہی اپنی ذات کا اتنا شعور حاصل کر سکے۔ وہ اپنے لیے آواز اٹھا نہ سکے۔ مرد ہمیشہ اپنی مرضی اور فائدے کے لئے عورت پر زنا کا الزام لگا کر اسے سماج میں رسوا کرتا رہا ہے۔ یہی وہ مضبوط ہتھیار ہے جس سے عورت کی ذات کو مشکوک اور بے معنی بنایا جا سکتا ہے۔

الغرض یہی سماجی رویے عورت کو کچھ خاص حدود و قیود کا پابند دیکھنا چاہتے ہیں جن میں رہ کر عورت اچھی عورت بن سکتی ہے۔ میں شک ان پابندیوں میں جکڑے کر اس کی ذات کسی جانور سے بدتر ہو جاتی ہے۔ کشور ناہید نے ان تمام پہلوؤں کا احاطہ اس آپ بیتی میں کیا ہے، جو عورت کی ذات کو کمتر سمجھتے ہیں۔ کشور ناہید عورت کے اس جبر و استحصال کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والی نمایاں شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔

کشور ناہید بھی اسی دور کی خاتون ہیں سید گھرانے سے تعلق رکھنے کی بناء پر انہیں بھی بیشتر ایسے ہی رویوں کا سامنا کرنا پڑا ایسے ہی ایک سماجی رویے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

> ایک دفعہ کسی اخبار میں بہت بڑی سی تصویر انعام لیتے ہوئے شائع ہوگئی لینے کے دینے پڑ گئے ساری پاکٹ منی خرچ ہوگی سارے چھوٹے بہن بھائی محلے کے بچے رشتہ دار اخبار اٹھا کر گھر آرہے تھے ہاتھ جوڑ کر سب سے بنتی کی گھر پر اماں ابا کو نہ پتہ چلے جلا دو چھپا دو اخبار۔[۳۶]

یہی معاشرے کا دوہرا معیار ہے اگر یہی کارنامہ گھر کے کسی صاحبزادے نے کیا ہوتا اور ان کی تصویر کسی اخبار میں چھپتی تو خاندان کے لئے عزت و وقار کا باعث بنتا اور محلے میں مٹھائیاں تقسیم کی جاتیں۔ اب چونکہ انعام لینے والی کشور ناہید ہے تو اس صورت میں اگر عورت کی تصویر اخبار میں چھپ گئی تو خاندان بھر کے لیے شرمندگی کا باعث بنے گی۔ الغرض معاشرہ کوئی ایسا حربہ نہیں چھوڑتا جس میں وہ عورت کو مرد سے کم تر نہ ثابت کر دے۔

اس معاشرے میں عورت کو اپنی مرضی سے کہیں آنے جانے کا حق حاصل نہیں۔ گھر والے ہر طرح سے عورت کے اوپر حق سمجھتے ہیں مگر اس کا حق دینے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں ہے۔

> خواتین کے لئے ایسے انداز کے باعث تمام شاعرات کے بارے میں تاثرات مجروح کن ہوتے تھے ان کو زائل بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مسئلہ تھا وقت کا، ساری ساری رات مشاعرہ پڑھو، اگلے دن صبح دفتر، پھر مشاعرے میں، ایسے فقرے بھی سننے کو ملتے کہ جب مشاعرہ گاہ کی سمت کسی چھوٹے سے شہر میں جا رہے ہوتے تو لوگ کہتے "لو جی اب شو شروع ہوگا کنجریاں بھی آگئی ہیں" اس کے علاوہ مشاعرہ کے منتظمین شاعرات کی منزلیت کرتے ہوئے مشاعرے میں نہیں بلاتے بلکہ مشاعرے کی دلچسپی اور رنگارنگی کو بڑھانے کے لئے بلاتے ہیں۔ بلاتے وقت یہ بھی اصرار کرتے ہیں کہ شاعرہ گانے والی ہو۔[۳۷]

کشور ناہید اپنی اس آپ بیتی میں جس دور کی عکاسی کر رہی ہیں اس دور میں عورت کے ساتھ غیر منصفانہ

سلوک روا رکھا جاتا تھا اور آج بھی عورت کی وہی حیثیت سماج نے متعین کی ہے نہ کل اس میں بدلاؤ تھا اور نہ ہی آج ہے۔

اس اقتباس میں بھی یہی نظر آتا ہے کہ عورت کو مشاعروں میں اس لیے بلایا جاتا ہے کہ وہ ایک عورت ہے اور اگر عورت ایک مشاعرے میں آئے گی تو زیادہ سے زیادہ لوگ شرکت کریں گے۔ کشور ناہید نے اس دور کے معاشرے کی عکاسی کی ہے کہ عورت کو ایک فرد کی حیثیت سے نہیں جانا جاتا بلکہ ہر شخص اس کی جنس کی بدولت اس سے متاثر ہوتا ہے۔ اس کی خوبصورتی اور کشش کی وجہ سے مرد اس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ اس کی شاعرہ ہونے کی کوئی وقعت نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ذہانت کو سراہا جاتا ہے بلکہ ہر معاشرے میں جنسی تفریق کی بنا پر عورت کی پہچان کی جاتی ہے اور عورت کو مختلف القابات سے نوازا جاتا ہے۔ ہمارا سماج عجیب طرح کے الفاظ عورت کے لئے استعمال کرتا ہے۔

کشور ناہید جس دور کی بات کر رہی ہیں اس دور میں بھی اور آج بھی مشاعروں میں جانے والی عورتوں کو اچھا نہیں سمجھا جاتا کیونکہ عورت معاشرتی پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ یہ پابندیاں اور حدود معاشرے نے متعین کر رکھی ہیں اور وہ بھی صرف عورت کے لئے ہے ہیں۔ مرد ان سب سے بری الزمہ ہے۔

عورت کو سماج ایک الگ تخلیق سمجھتا ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں اسے کمتر سمجھا جاتا ہے۔ اگر وہ کما کر لاتی ہے تو اس کمائی کو وہ اپنی مرضی سے استعمال نہیں کر سکتی اگر اس کی اولاد ہے تو وہ ان پر اپنا اتنا حق نہیں رکھتی کہ انہیں اپنی مرضی سے پروان چڑھا سکے۔ اگر وہ معاشرے میں اٹھتی بیٹھتی ہے تو بھی اسے کچھ حدود و قیود کا سامنا ہوتا ہے۔ مرد عورت کی بڑائی کو تسلی نہیں کر سکتا اسے محسوس ہوتا ہے کہ عورت کسی بھی لحاظ سے بلند درجہ اختیار کر رہی ہے تو وہ کہانی کا رخ اپنی طرف موڑ دیتا ہے اور ساری داد تو خود وصول کرتا ہے جس کے لیے عورت نے دن رات محنت کی ہوتی ہے اس محنت و کوشش کے باوجود اسے اس کا صلہ نہیں دیا جاتا۔

> پیدا ہوتے ہیں یہ جس نے بھگاری دال بھائیوں اور باپ کے لیے سنبھالی ہو۔ اور باقی دیگچی میں سے سب کو دینی سیکھی ہو جس نے بوٹیوں والا شوربہ مردوں کو اور خالی آلو شوربہ باقی گھر میں تقسیم ہوتا دیکھا ہو۔ اس کے اندر پرانی اور نئی دونوں عورتیں پرورش پاتی ہیں۔[۳۸]

کشور ناہید کو شروع سے ہی بنیادی حقوق سے محروم رکھا گیا۔ انھیں زندگی کے ہر موڑ پر مرد کے مقابلے میں ناانصافی کا سامنا کرنا پڑا۔ عورت کے لئے انتہائی مسائل ہیں جن کا سامنا سے ہر دور میں کرنا پڑ رہا ہے ان مسائل اور سماجی ناانصافیوں نے عورت کی ذات کو الجھا کر رکھ دیا ہے۔ وہ چاہ کر بھی اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے سے قاصر ہے۔

> خاندان میں کوئی شادی ہے تو چھٹی والے دن آپ کو دفتر لگا کر بیٹھنے کا حکم ملے گا اور صاحب شادی کا

کھانا کھا کر آپ کو فون کریں گے۔اب دفتر بند کر۔ وگھر جاؤ۔ میں تو لوگوں سے تمہاری خاطر مل مل کر پریشان ہو گیا ہوں۔ ذرا محتاط ہو کر نوکری کرو۔ شہر میں تمہاری شہرت بحال کرتے ہیں مجھے کافی دقت ہوئی۔[۳۹]

عورت اگر معاشی طور پر خود کو مستحکم بنانے کے لیے کوئی قدم اٹھاتی ہے تو بھی یہ معاشرہ اسے چین سے جینے نہیں دیتا۔اسے طرح طرح کے سماجی رویوں کا سامنا دن بھر کرنا پڑتا ہے اور وہ گھر سے شروع ہو کر باہر تک جاتے ہیں۔گھر کے مرد ان کی کمائی پر عیش کرنے کے باوجود انھیں نوکری کی آزادی اور عیاشی کی زندگی کا طعنہ دیتے ہیں۔دن بھر کام کرنے کے باوجود گھر کی ذمہ داریوں سے فرار کا طعنہ سنتی ہے۔

کشور ناہید اس عورت کی زندگی بیان کر رہی ہیں جسے ایک طویل سفر طے کرنا پڑتا ہے اور اس کی کوئی منزل نہیں ہمارا معاشرہ عورت کے کردار پر انگلی اٹھانے میں ایک منٹ نہیں لگاتا۔عورت کہیں بھی ہو اسے سب سے پہلے شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔کشور نے ان سب مسائل کا سامنا کیا اور اسی لیے وہ شاید ہر اس عورت کی عکاسی کر رہی ہیں جو یہ ظلم و ستم برداشت کرتی ہے۔وہ کہتی ہیں کہ:

تعلق کا لفظ نا جانے کس نے اختراع کیا تھا۔ایک رسالہ کے مدیر کالج کے زمانے میں گھر غزل لینے پہنچ گئے۔گھر والوں نے اسے تعلق سمجھ لیا۔ریڈیو پہ طلبا کے پروگرام میں پروڈیوسر نے غزل پڑھوالی۔گھر تک چھوڑنے آئے، تعلق بنانے پہ تل گئے۔افسر سے بات کر لی۔افسر اور زمانے ،دونوں نے اس کو تعلق سمجھ لیا۔کسی کھانے پہ کسی سے بے تکلفی سے بات کر لی۔بس تعلق کی تہہ استوار ہو گئی۔[۴۰]

یہی مرد حضرات عورت کے لئے حدود و قیود بھی متعین کرتے ہیں تاہم اگر عورت کے مقابلے میں مردوں کے لئے حدود و قیود کو متعین کر دی جائے تو یہ معاشرہ اصلاح کی طرف زیادہ قدم بڑھائے گا. معاشرے میں اگر مرد کوئی اخلاق سے گری ہوئی حرکت کرے تو صرف اس لئے خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے کیونکہ ایک مرد ہے۔

کشور ناہید اپنی اس آپ بیتی میں انہی حدود و قیود سے باغی نظر آتی ہیں کیونکہ وہ اپنی تمام تر زندگی اسی جبر مسلسل میں نہیں گزارنا چاہتیں۔اس لئے وہ ان حدود کو جو معاشرے نے ایک عورت کے لیے مقرر کر رکھی ہیں انہیں توڑنا چاہتی ہیں۔

سماج میں موجود عورتوں کو ان کا وہ حق حاصل نہیں ہوتا، جس سے وہ اپنی زندگی کا ہر فیصلہ اپنی مرضی کے مطابق کر سکیں۔انھیں سماجی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی گو کہ ہر طور پر بہت کم تر سمجھا جاتا ہے اور وہ ہر طرح سے ظلم کا شکار ہوتی آرہی ہیں اور ظلم سہتی رہتی ہے دوسری طرف ان سے ہر کام میں توقعات مرد سے زیادہ رکھی جاتی ہیں۔

کشور ناہید نے بہت عمدہ انداز میں معاشرے میں موجود لوگوں کی فکر، عورت کے حوالے سے معاشرتی شعور، مرد اور عورت کے درمیان فرق کو اس آپ بیتی میں بیان کیا ہے۔

کشور ناہید نے عورت کے ساتھ ہونے والی معاشی ناانصافیوں کو بہت عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ وہ کیسے دن رات ایک کر کے نوکری تلاش کرتی ہے نئی نویلی دلہن کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جاتا ہے پھر اسے دھمکیاں دی جاتی کہ وہ کما کر نہ لائے تو اس سے بیٹا چھین لیا جائے گا۔ گویا ہر لمحہ اس کو اذیت دی جاتی ہے۔

> پھر صبح گھر کا کام پھر یونیورسٹی پھر دفتر پھر گھر اور رات کا ہر پہر گفتگو کی کڑواہٹوں میں تبدیل ہوتا اس نے تمہاری طرف آج دیکھا تھا اس نے تمہاری پلیٹ میں سالن ڈالا تھا اس دن وہ آیا تھا اور وہ نہیں آیا تھا۔ اس کتاب کو گناہ گاروں میں بزرگ بھی تھے ہم عمر بھی اور چھوٹے بھی۔[۴۱]

کشور ناہید نے اس آپ بیتی میں عورت کے ظلم و ستم کو جس طرح سے بیان کیا ہے اس پر بہت سے لوگ ان کے نظریات سے برہم ہوئے۔ کیوں کہ جب حقیقت سے پردہ فاش ہوتا ہے تو تلخیاں سامنے آتی ہیں۔ صدیاں گزرنے کے باوجود بھی استحصالی رویے قائم و دائم ہیں۔ آج بھی عورت اپنی ہر ذمہ داری کو بخوبی انجام دینے کے باوجود بھی بری سمجھی جاتی ہے، طعنے سنتی ہے اس کی عزت غیر محفوظ ہوتی ہے۔ وہ مرد جس کو اس کا محافظ بنایا جاتا ہے وہ اس کو مجبوراً ملازمت کرواتا ہے اور پھر اسے کسی اور کے ساتھ دیکھ کر اس کے کردار پر انگلیاں اٹھاتا ان سب تلخ حقیقت کو کشور ناہید نے بیان کر کے معاشرے کے مکروہ چہرے سے پردہ ہٹایا ہے۔

ہمیشہ دیکھا گیا ہے کہ معاشرتی لحاظ سے کبھی عورت کو اپنی مرضی کے مطابق کام نہیں کرنے دیا گیا۔ ایک عورت جب بھی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا کام سرانجام دینے لگتی ہے تو اس کی راہ میں طعنوں اور برائیوں کے ساتھ روڑے اٹکائے جانے لگتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاشرے کا اولین فریضہ عورت کو کوئی بھی کام اپنی مرضی سے نہ کرنے دینا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ معاشرے نے عورت کی زندگی کے ہر فیصلے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ ایسے ہی کئی رکاوٹوں کو کشور ناہید نے اپنی آپ بیتی میں بیان کیا ہے۔

> ہر نظم یا غزل لکھنے کے بعد، میں نے گھر میں دکھائی، جب کہ جی کرتا ہے share کرنے کو۔ ہر نظم اور ہر غزل پہ گھر کے کسی نہ کسی واقعے کا عکس رقم کر کے اس کو ناقابل برداشت قرار دے دیا جاتا تھا۔ میں اتنی بددل ہوئی کہ پھر وہی اپنی ماں کے گھر والا رویہ اپنا لیا۔ غزلیں لکھنی اس وقت جب کوئی نہیں دیکھ رہا اور رکھ لیں چھپا کر دفتر کی دراز میں۔[۴۲]

متذکرہ اقتباس کے مطابق اگر یہی کام کوئی مرد کر رہا ہوتا تو روزانہ کی بنیاد پر اس کی غزل کے اشعار رسنے جاتے اور اسے سراہا جاتا مگر عورتوں کے معاملے میں بخیل معاشرہ لکھنے لکھانے کے کام میں بھی راہیں متعین کر ڈالتا ہے

کہ فلاں لکھے گے اور فلاں نہیں لکھے گی۔ اس جیسی کئی دوسری باتیں جو اس معاشرے کا خاصہ ہیں۔ کشور ناہید ایک ایسے معاشرے میں پل بڑھ رہی تھیں جہاں عورت کا پڑھنا، بولنا کھیلنا برائی سمجھا جاتا تھا۔ ان کا گھرانہ پھر کچھ پڑھا لکھا تھا، اس کے باوجود انھیں ایسی مشکلات کا سامنا رہا یہی وجہ کہ ان کے معاشرے کے نچلے طبقے کی عورت اس سے بھی زیادہ تنگ نظری کا شکار ہوئی ہو گی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی آپ بیتی میں اپنے معاشرے کا عورتوں کے حوالے سے رویہ بیان کیا ہے۔

ہمارا معاشرہ جیسے چاہتا ہے عورت کو دیکھتا ہے جو بات معاشرہ عورت کے لیے کہہ دے گا وہ حرف آخر بنا دی جاتی ہے۔ عورت کو برا کہہ دے گا تو بری سمجھی جانے لگے گی۔ اس بات کا اندازہ ہم اس اقتباس سے لگا سکتے ہیں:

> کسی سے پوچھو فلاں خاتون کی کہانی سنی؟ جواب ملے گا کہانی کہاں۔ ہم تو اس کی low neck دیکھنے گئے تھے۔ کسی سے پوچھو "فلاں کی نظم سنی "جواب ملے گا، نظم کا تو پتہ نہیں اس کی sleeveless بانہیں اچھی لگتی ہیں۔ کسی سے پوچھو فلاں کا مضمون سنا، جواب ملے گا "بھاڑ میں گیا مضمون، ہمیں تو یہ اچھا لگتا ہے کہ اسے واپس چھوڑنے جائیں رستے بھر مسکراتی رہتی ہے۔ شرماتی بہت ہے مجھ سے۔ یقیناً بات سمجھتے ہے "سوال" یہ کسی کی بیوی نہیں، جواب ہاں ہو گی مگر اچھی ہوتی تو گھر سے ہی کیوں نکلتی۔"[۴۳]

یعنی مرد جیسے چاہے گا عورت کے کردار پر بات کرے گا اور پھر سارا معاشرہ اس کے نقش قدم پہ چلنے لگے گا۔ کوئی عورت کس وقت گھر سے باہر نکلتی ہے اس وقت کو وجہ بنا کر اس کے کردار کی نوعیت کا تعین کر لیا جاتا ہے۔ اس معاشرے نے عورت کو پرکھنے کے طریقے بھی خود ہی منتخب کر رکھے ہیں۔ یعنی یہاں سماجی رویہ یہ ہے کہ جو عورت گھر سے باہر نکلتی ہے وہ بری عورت ہی ہے اور بس یہ ٹھپہ لگا دیا جاتا ہے کون بری کون اچھی ہے۔ یہاں بھی معاشرہ طے کرے گا کہ عورت کو کس وقت کہاں ہونا چاہیے "مجھے کتابیں پڑھنے کو نہیں دی گئیں، میں تو اپنے سرہانے ادبی کتاب بھی کورس کی کتاب میں چھپا کر رکھ کر پڑھتی تھی۔"[۴۴]

ہم جب کشور ناہید کی تحریروں کو دیکھتے ہیں تو سمجھ آتی ہے کہ وہ کس قدر علم دوست خاتون ہیں لیکن اس قسم کے اقتباس دیکھ کر لگتا ہے کہ ان کے معاشرے میں کتاب کا انتخاب بھی عورت کی مرضی سے نہیں ہو پاتا تھا اور معاشرہ ہی انتخاب کرے گا کہ یہ کیا پڑھے گی اور کیا نہیں۔ عورت کی قوت خود ارادی کو بھی معاشرے نے اپنے ہی ہاتھ میں لے رکھا ہے کہ شاید عورت آگے بڑھے گی تو معاشرے کے تسلط سے نکل جائے گی۔ بہر کیف عورت کے فیصلے اس کے حق میں ہوں یا اس کے خلاف معاشرے نے ہی ان کا تعین کرنا ہے۔

> پینٹ اور پبلشر، پبلشر کو معلوم ہے کہ کوئی ناول ہزاروں سے کم نہیں بکتا اور لڑکی کے نام کا ناول تو ہاتھوں ہاتھ، ہر ریلوے اسٹال، ہر ڈبے اور ہر گھر بیٹھی خاتون کے لیے وقت کاٹنے کا بہترین سرمایہ

ہوتا ہے۔ رشتوں کے انتظار میں بیٹھی لڑکیاں، انہی ناولوں کے سہارے اپنے بالوں میں اترتی چاندی کو برداشت کرتی اور ان ہی ناولوں کہ کرداروں میں ڈوب کر، گھر کی چار دیواری کو مقدر بنائے اپنی نحوستوں کی کلونس دھوتی ہیں۔[۴۵]

شناسائیاں رسوائیاں میں سماجی شعور کا مطالعہ:

عورت کے ساتھ جب بے جا روک ٹوک رکھی جائے یا اسے اپنے بنیادی حقوق سے محروم کیا جائے تو اس کے نتیجے میں عورت کے اندر بغاوت کا عنصر جنم لیتا ہے۔ پھر جب عورت سماج کے اس رویے کے خلاف آواز بلند کرتی ہے تو اسے بے راہ روی کا شکار ایک باغی عورت تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے کردار پر کیچڑ اچھالا جاتا ہے۔ کیچڑ اچھالنے والا یہ مردانہ معاشرہ کبھی اپنے گریبان میں جھانک کر عورت کے اس باغی رویے کے اسباب جاننے کی کوشش کبھی نہیں کرتا اور نہ ہی کبھی اپنی غلطی تسلیم کرتا ہے۔ عورت اس سماج کا حصہ ہے لیکن اس سماج کے مرد عورت کا استحصال کرتے ہیں۔ اسے اس معاشرے میں کمتر جنس سمجھا جاتا ہے۔ عورت کو وہ حیثیت اور مرتبہ نہیں دیا جاتا جس کی اہل وہ ہمیشہ سے رہی ہے۔ اس پر بے جا روک ٹوک اور پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ یہ ہی ہمارا سماجی رویہ ہے جس کے تناظر میں کشور ناہید لکھتی ہیں:

> میری یادیں جھوٹی نہیں ہیں۔ اس لیے سچ بتاؤں میرے اندر یوں روک ٹوک اور صوفی صاحب کو نا پسند کرنے والے گھر والوں سے ایمان اٹھتا گیا اور صوفی صاحب کی محبت اور ان کے گھر والوں سے تعلق بڑھتا گیا۔[۴۶]

ہمارا سماج عورت کی حق تلفی کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ عورت کسی بھی مجبوری یا ذاتی غرض سے جب گھر سے نکلتی ہے تو اسے بہت سے تلخ رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کوئی بھی شخص اس کی مجبوری کو نہیں سمجھتا۔ اگر اسے گھر لوٹنے میں دیر ہو جائے تو اس کے کردار کو بیچ چوراہے میں لا کھڑا کیا جاتا ہے۔ ہر طرح کے الزامات سہتی یہ عورت ہر عیب کی حق دار ٹھہرائی جاتی ہے۔ عورت کو قدم قدم پر جنسی تفریق کا سامنا رہتا ہے۔ کشور ناہید اپنی اس آپ بیتی میں ایسی ہی عورت کی بات کرتی ہیں جو معاشرے کے تمام ظلم سہتی اور بے جا پابندیوں کی زنجیر کو توڑتی ہوئی اپنی شخصیت کو ابھارنے کے لیے کوشاں نظر آتی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> یہ وہ زمانہ تھا جب لاہور اسٹیشن پر نعتیہ مشاعرے میں کسی خاتون کو مدعو نہیں کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سلام اور مرثیے کے موقع پر بھی تخصیص برتی جاتی وزیر اطلاعات تھے کوثر نیازی۔ میں نے ایک دن ان سے کہا "مجھے وہ حدیث دکھا دیں جس میں خواتین کو نعت پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔[۴۷]

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کو مذہبی تقریبات سے دور رکھا جاتا۔ ہر جگہ مردوں کی اجارہ داری نظر آتی ہے۔ کشور ناہید ان سب سے پابندیوں کے خلاف سراپا احتجاج رہی ہیں۔ اسی لیے وہ اپنے حق کے لیے آواز بلند کرتی نظر آتی ہیں۔ یہ مردانہ معاشرہ عورت کی کامیابی کو دیکھنا تو درکنار اسے اپنے برابر بیٹھنے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ عورت کو کب، کہاں اور کیا کرنا چاہیے یہ معاشرہ ہی متعین کرتا ہے۔ معاشرہ عورت کے سر پر لٹکتی ہوئی تلوار ہے جو کسی بھی لمحے اس کا سر قلم کر سکتی ہے۔ کشور ناہید اس سماج کی ثنویت کو بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ اس زمانے میں ریڈیو اسٹیشن میں میڈم نور جہاں گانا گاتیں جسے صوفی صاحب لکھا کرتے۔ "میڈم کے گھر سے ریڈیو اسٹیشن کے پورے خاندان کے لیے کھانا آتا تھا۔ صوفی صاحب سر کھجا کر کہتے "ذرا کھانے کے بعد، لکھوں گا" کبھی کہتے "میرے ول تکی جاتے میں لکھی جاواں گا"۔ [۴۸]

کشور ناہید یہاں اس حقیقت کو بیان کر رہی ہیں کہ ہر شعبے میں مرد کی فلاح بہبود کے پس پردہ کہیں نہ کہیں عورت کا ہاتھ ہے۔ تاہم اس وفاداری کے صلے میں بھی ہمیشہ عورت کو ندنامی اور بے حیائی کے طعنے ملے ہیں۔

> پڑھے لکھے نوجوان یا تو شیزان اور ینٹل جاتے تھے یا کانٹی نینٹل، امیر زادے اور منظور قادر جیسے ثقہ لوگ، الگ کونوں میں بیٹھے ہوتے۔ گورنمنٹ کالج اور لاء کالج کے لڑکے کھڑکی کی جانب بیٹھتے کہ سڑک سے گزرتی لڑکیوں کو بھی دیکھ لیں۔ ان ریسٹورنٹ میں لڑکیاں بہت کم بلکہ خال خال ہی نظر آتی تھی۔ [۴۹]

کشور ناہید اس اقتباس میں مردوں کا دوغلا پن دکھا رہی ہیں۔ مرد جو کہ شرافت کا لبادہ اوڑھ کر اپنے گھر کی عورتوں کو توسات پردوں میں چھپا کر رکھتے ہیں۔ مگر دوسروں کی بہن بیٹیوں پر گھات لگا کر بیٹھے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے گھر کی عورتوں کو گھروں میں ہی محفوظ سمجھتے ہیں کیونکہ وہ خود ایک بیمار ذہنیت کے مالک ہیں۔ جبکہ دوسری عورتوں کا جینا دوبھر کر کے اپنی مردانگی پر فخر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

کشور ناہید نے واقعات کو لکھتے ہوئے کسی بات کا لحاظ نہیں رکھا۔ جس کو جیسا پایا ویسا ہی بیان کر دیا۔ غفور شاہ قاسم لکھتے ہیں:

> انھوں نے اپنی آپ بیتی میں مختلف چہروں پر پڑے نقابوں کو اتار پھینکا ہے یہ کتاب انتہا درجے کی حقیقت نگاری کی عکاس ہے۔ [۵۰]

کشور ناہید نے جب اپنی آپ بیتی لکھی تو انہیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس پر طرح طرح کے اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی گئی۔ انہوں نے اس آپ بیتی میں یہی بتانے کی کوشش کی ہے کہ اگر عورت خود اپنی مرضی سے لکھے یا عورت پہلے سے مقرر کیے ہوئے دائرے سے بھی قدم باہر نکالنا چاہے تو اس کی زبان بند کر دی جاتی ہے

۔اسے تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور ایسی عورت کو مکمل طور پر نظر انداز کیا جاتا ہے لیکن عورت کے نام پر لکھے گئے ناول لازمی بکتے ہیں۔ مرد عورت کا نام استعمال کرتے ہوئے برائی محسوس نہیں کرتا بلکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے نام سے جو چیز بیچوں گا وہ ضرور بکے گی۔

کشور ناہید نے اپنی اس آپ بیتی میں عورت کے حوالے سے زیادہ ذکر کیا ہے اور اس کی مظلومیت کو پیش کیا ہے اس آپ بیتی سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ مرد ذات سے سخت بیزار ہیں کشور ناہید اس اقتباس میں بھی عورت کے حساس موضوع پر گفتگو کر رہی ہیں کہ کس طرح ایک عورت مردوں کی جھوٹی شان کی خاطر اپنی پوری زندگی وقف کر دیتی ہے۔ وہ ساری زندگی صبر سے کام لیتی ہے اور اپنی پریشانیاں برداشت کر کے زندگی گھر کی دہلیز پر گزار دیتی ہے یوں ظلم مسلسل سہتی رہتی ہے۔

کشور ناہید نے ان سب پابندیوں کا ذکر کیا ہے جو عورت کی شخصیت کو مسخ کر کے رکھ دیتی ہیں اس آپ بیتی میں بھی ایک جگہ جمیلہ ہاشمی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> اول تو یہ ہوا کہ ان کے علاقے کے دستور کے مطابق ایک دودھ پلائی رکھی گئی۔ اتفاق سے اس کی بچی بھی چند ماہ کی تھی۔ وہ بچی، پلنگ کے ساتھ بندھے دوپٹے کے پالنے میں پڑی رہتی اور وہ دودھ پلائی دایہ، عائشہ کو اپنا دودھ پلاتی۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت غصہ آتا۔ میں نے کہا: "سوچو، جو عورت اپنی بچی کو رلا رہی ہے اور تمہاری بچی کو دودھ پلا رہی ہے، وہ دودھ زہر ہو گا کہ نہیں۔[۵۱]

بحیثیت مجموعی دونوں شاعرات کی آپ بیتیاں عورت کے حوالے سے سماجی رویوں کا بہترین اظہار ہیں ہمارے سماجی قوانین جس انصاف، برابری اور مساوات کی بات کرتے ہیں۔ وہ صرف اور صرف مردوں اور صاحب اقتدار طبقے سے عبارت ہیں۔ جہاں عورت کی بات یا اس کا حوالہ آتا ہے وہاں یہ سب قوانین گونگے اور خاموش ہیں۔ ان آپ بیتیوں کے تناظر میں دیکھا جائے تو سب سے ہی اہم سماجی رویہ عورت کا معاشی حوالے سے استحصال ہے. عورت گھر میں رہ کر شوہر اور بچوں کی خدمت کرے تو اسے کمتری اور بے حیثیتی کا احساس دلایا جاتا ہے ایسے میں اس کی وفاداری اور چوبیس گھنٹے کی ذمہ داریاں کوئی معنی نہیں رکھتیں. دوسری جانب اگر وہ نوکری کرتی ہے تو اس کو خود اپنا پیسہ استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں دیا جاتا اس بات کا فیصلہ اس کا شوہر یا اس کے گھر کے مرد کرتے ہیں کہ کب اور کہاں پیسہ خرچ کیا جائے گا۔

کشور ناہید اور ادا جعفری نے اس معاشرتی سوچ کو بھی نشانہ تنقید بنایا ہے کہ عورت اپنی تخلیقات (اپنے بچوں) کے بارے میں بھی کوئی فیصلہ کرنے کی اہل نہیں۔ یہ حق اس سے اسی دن لے لیا جاتا ہے جب وہ بچہ پیدا کر دیتی ہے اس کے علاوہ دونوں شاعرات کی آپ بیتیاں اس معاشرتی سوچ کی بھی عکاس ہیں جو عورت کو کمتر، کند ذہن اور

بے عقل قرار دیتی ہے۔اس کے بر عکس مردوں کی جہالت اور کم عقلی کو ان کی مردانگی کے پردے میں چھپا دیا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر دونوں شاعرات کی آپ بیتی ہمارے سماجی رویوں کا حقیقی عکس پیش کرتی ہیں شاعر چونکہ معاشرے کا حساس فرد ہوتا ہے اس لئے ادا جعفری اور کشور ناہید نے ان رویوں کو نہ صرف بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا بلکہ انہیں اپنی آپ بیتی میں من و عن بیان بھی کر دیا ہے. یوں یہ آپ بیتیاں ان شاعرات کی زندگی کا احوال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ پورے سماج کی مجموعی سوچ کی بھی عکاس ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ اداجعفری،جو رہی سو بے خبری رہی(کراچی: مکتبہ دانیال،۱۹۹۵ء)،ص۷۔

۲۔ ایضاً،ص۱۰۔

۳۔ ایضاً،ص۳۰۔

۴۔ ایضاً،ص۳۰۔

۵۔ ایضاً،ص۶۰۔

۶۔ ایضاً،ص۱۰۴۔

۷۔ ایضاً،ص۱۸۹۔

۸۔ ایضاً،ص۲۱۵۔

۹۔ ایضاً،ص۱۵۸۔

۱۰۔ ایضاً،ص۱۶۶۔

۱۱۔ عصمت جمیل،اردو افسانے میں عورت کا تصور غیر مطبوعہ مقالہ، برائے پی ایچ ڈی، شعبہ اردو، بہاؤالدین زکریایونی ورسٹی، ملتان،۱۹۹۷ء، ص۸۹۔

۱۲۔ ایضاً،ص۲۷۶۔

۱۳۔ ایضاً،ص۳۶۳۔

۱۴۔ ایضاً،ص۳۶۵۔

۱۵۔ ایضاً،ص۳۶۵۔

۱۶۔ کشور ناہید،بری عورت کی کتھا(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص۱۱۔

۱۷۔ ایضاً،ص۴۶۔

۱۸۔ ایضاً،ص۳۰۔

۱۹۔ ایضاً،ص۳۲۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۳۱۔

۲۱۔ ایضاً، ص ۳۵۔

۲۲۔ ایضاً، ص ۵۰۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۵۴۔

۲۴۔ ندیم احمد، بیسویں صدی میں خود نوشت سوانح عمری (پٹنہ: خدا بخش لائبریری جرنل، ۲۰۰۲ء)، ص ۱۳۴۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۵۶۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۵۶۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۵۹۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۷۸۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۰۳۔

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۳۰۔

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۲۸۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۳۴۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۱۳۵۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۱۔

۳۵۔ ایضاً، ص ۳۱۔

۳۶۔ ایضاً، ص ۵۰۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۰۸۔

۳۸۔ ایضاً، ص ۶۱۔

۳۹۔ ایضاً، ص ۶۳۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۶۶۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۷۳۔

۴۲۔ ایضاً، ص ۹۶۔

۴۳۔ ایضاً، ص ۹۵۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۶۱۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۱۲۔

۴۶۔ کشور ناہید، شناسائیاں رسوائیاں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)، ص ۸۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۳۸۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۴۵۔

۴۹۔ ایضاً، ص ۴۶۔

۵۰۔ غفور شاہ قاسم، پاکستانی شناخت کی نصف صدی (راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء)، ص ۲۹۲۔

۵۱۔ کشور ناہید، شناسائیاں رسوائیاں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء)، ص ۸۸۔

ماحصل

ماحصل

آپ بیتی کی تاریخی حیثیت واہمیت کبھی کم نہیں ہو سکتی۔ داخلیت پر خارجیت کے اثرات بہر صورت موجود ہوتے ہیں۔ آپ بیتی کا سفر فرد سے افراد کی جانب ہوتا ہے۔ یہ ہر عہد کے داخلی جذبوں اور سماجی رویوں کا دستاویزی ثبوت ہوتا ہے۔ آپ بیتی لکھنے کا عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک انسانی حیات کا ظہور ہے اور کسی فرد کا وجود قائم ہے۔ آپ بیتی کی صنف آنے والی نسلوں کے لیے رہنمائی کا کام کرتی ہے۔ آپ بیتی کی تعریف کے حوالے سے مختلف ماہرین اور ناقدین نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ جس کی روشنی میں آپ بیتی کی جامع تعریف جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو آپ بیتی کے سرمائے پر نظر ڈالی جائے تو اسلوب کے لحاظ سے ان میں بڑا تنوع ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء تک کے عہد کو اردو آپ بیتی کا ارتقائی دور کہا جا سکتا ہے۔ اس وقت تک خود نوشت سوانح عمری لکھنے والوں کے سامنے کوئی قابل تقلید نمونہ نہیں تھا۔ سب نے اپنے اپنے انداز میں آپ بیتیاں لکھی ہیں۔ یہ سب آپ بیتیاں الگ الگ نوعیت کی حامل ہیں لیکن تہذیب و تمدن میں تغیرات کی نشان دہی کرتی ہیں۔ خواتین مصنفین کی آپ بیتیوں کا جائزہ لیتے ہوئے انسان کے ذہن میں یہ سوال جنم لیتا ہے کہ وہ کون سے محرکات تھے جن کی وجہ سے خواتین نے اس صنف میں قلم اٹھانے کی طرف توجہ دی۔ اپنی زندگی کے حقائق کو دوسروں کے سامنے پیش لانا جہاں مرد کے لیے ایک ناممکن سا امر ہے پھر عورت جو کہ صدیوں سے معاشرتی پابندیوں میں جکڑی ہوئی اس کے لیے یہ کام آسان نہیں تھا۔ اس لیے اس موضوع کی اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس مقالے کی بنیاد ان سوالات پر رکھی گئی ہے۔

۱۔ خواتین کی آپ بیتیوں میں ادراک ذات کی معنویت کیا ہے؟

۲۔ ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں بطور عورت معروضی رویوں اور انفرادی تشخص کا اظہار کس طرح سے کیا گیا ہے؟

۳۔ دونوں شاعرات کی آپ بیتیوں میں بہ حیثیت عورت سماجی رویوں کی پیش کش کی نوعیت کیا ہے؟

ان سوالات کی بنیاد پر اس مقالے کو لکھا گیا ہے۔ مقالہ لکھتے ہوئے اس بات کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ ان سوالات کے جوابات ڈھونڈے جا سکیں۔ خواتین مصنفین کی آپ بیتیوں میں ان کی ذات کے ان پہلوؤں کو جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ جنہوں نے ان کے اندر اپنے آپ کو پہچاننے اور اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے پر آمادہ کیا۔ اپنی ذات کی پہچان جنسیت کے امتیازات سے بالاتر ہو کر بطور انسان ان کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اپنے وقت

،حالات اور محدود وسائل ہونے کے باوجود اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے انہوں نے کن کن مشکلات کو جھیلا اور اپنی ذات کے ادراک میں کامیاب ہوئیں۔

ادا جعفری اور کشور ناہید کی آپ بیتیوں بطور عورت معاشرے کے معروضی رویوں اور انفرادی تشخص کا جائزہ لیا گیا ہے کہ معاشرہ عورت کو کن کن زاویوں سے پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ عورت کے لیے مرد اصول وضوابط قائم کر کے اور ان پر عمل کرانے کی حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے۔ معاشرے کے بنائے گئے ان کھوکھلے اصولوں کو عورت ذات کی نفی اور مرد کی برتری قائم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ جو عورت ان کے بنائے گئے اصولوں سے انحراف کرے گی وہ اس سماج کے لیے ایک باغی کردار کے طور پر جانی جائے گی اور اس کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ عورت اپنی پوری زندگی میں سماجی رویوں کو جھیل کر اپنی زندگی بسر کرتی ہے۔ سماج کا عورت کے لیے مسلسل غیر مساویانہ رویہ، مرد اور عورت کی تخصیص نے خواتین کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ یہ سب عورت کے لیے ہی کیوں ہے۔ عورت بھی ایک انسان اور جیتی جاگتی مخلوق ہے۔ اس کے بھی احساسات اور جذبات ہیں۔ جن کو صدیوں سے روندا جا رہا ہے۔

اس کے علاوہ قیام پاکستان سے قبل اور بعد میں لکھی جانے والی آپ بیتیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ان کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلی قسم جزوی آپ بیتیوں پر مبنی ہے۔ ان آپ بیتیوں میں سب سے پہلی آپ بیتی کالا پانی ہے ۔کالا پانی سزا کی داستان ہی نہیں بلکہ اس میں جزائر انڈمان کی معاشرت کی جھلکیاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ میرا افسانہ اور قید فرنگ انگریزوں کے انتقام کی داستانیں ہیں۔ خون بہا میں جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے وہ قدرے آپ بیتی کے تقاضوں کے مطابق ہے مگر یہ آپ بیتی کی تعریف پر پورا نہیں اترتی ۔اس میں حکیم احمد شجاع نے اپنے عقائد ،افکار اور نظم و نثر کے خیالات کے ساتھ ساتھ اپنے بزرگوں ،استادوں اور رفیقوں کا تذکرہ کیا ہے۔ دوسری قسم کی آپ بیتیاں کسی حد تک مکمل اور زندگی کے ایک بڑے حصے کی ترجمان ہیں۔ میری کہانی میری زبانی میں جزئیات نگاری سے کام لیتے ہوئے واقعات کو سیدھے سادھے انداز میں پیش کیا ہے۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی میں مولانا ابوالکلام آزاد اپنے منفرد انداز میں اپنے حالات زندگی قلم بند کیے ہیں۔ داستان غدر میں مغل تاج دار اور ان کے اہل خانہ کی بے کسی، قتل وغارت کے واقعات پر مشتمل ہے۔ آپ بیتی از خواجہ حسن نظامی نے اپنے مریدین کی عقیدت کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی حقیقی ذات کو کسی حد تک چھپا دیا ہے۔ میری کہانی میری زبانی میں سید ہمایوں نے جزئیات نگاری سے کام لیتے ہوئے واقعات کو سیدھے سادھے انداز میں بیان کیا ہے۔ اعمال نامہ میں سر سید رضا نے اپنے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی سیاسی تاریخ بھی پیش کی ہے۔ شہاب نامہ میں قدرت اللہ شہاب نے اپنے ذاتی حالات ومشاہدات کے ساتھ ساتھ

مسلمانان برصغیر کی تحریک آزادی کے پس منظر، مطالبہ پاکستان، قیام پاکستان اور تاریخ پاکستان کی داستان سنائی ہے۔ان آپ بیتیوں کے مختلف پہلوؤں کے مختصر جائزے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کی تاریخی حیثیت سب سے زیادہ مستحکم ہے۔ شخصیات دفن ہو جاتی ہیں مگر ان کے کارنامے تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو آپ بیتی کے فن میں خواتین بھی کسی سے پیچھے نہیں رہیں۔انہوں نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔خواتین کی آپ بیتیوں میں ادراک ذات کا مطالعہ کیا ہے۔شہر بانو بیگم کی آپ بیتی بیتی کہانی اردو کی اولین خود نوشت ہے۔بیتی کہانی میں شہر بانو بیگم نے اپنے حالات زندگی، رسم ورواج، تہذیب و معاشرت، غدر کے حالات کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔ عصمت چغتائی کی کاغذی ہے پیرہن میں بچپن کی تلخ یادوں، رسم ورواج کی گھٹن اور خواتین کی مکاریوں کو بیان کیا ہے۔رسیدی ٹکٹ میں امرتا پریتم نے اپنی ذات کی سچائیوں کو من وعن بیان کیا ہے۔انہوں نے اپنے حالات وواقعات کو بڑی بے باکی سے پیش کیا ہے۔جنت سے نکالی ہوئی حوا کے عنوان سے نفیس بانو شمع کی یہ آپ بیتی ان کی زندگی کے غم والم اور جہد پیہم کی کہانی ہے۔انھوں نے متوسط طبقے کی کمزوریوں، محرومیوں، ناکامیوں اور ان سے پیدا ہونے والی نفسیاتی کشمکش کو اپنی ذات کے حوالے سے پیش کیا ہے۔نوائے زندگی ساجدہ زیدی کی خود نوشت ہے۔جس میں ان کی شخصیت، زندگی اور خاندان کے واقعات اور آزادی کے بعد مسلمانوں کے استحصال کا ذکر شامل ہے۔شورش دوراں میں حمیدہ سالم نے اپنی گھریلو زندگی، جاگیر دارانہ نظام اور اپنے درس و تدریس کے شعبے کو موضوع بنایا ہے۔باب دوم میں خواتین مصنفین کی آپ بیتیوں میں معروضی رویوں اور انفرادی تشخص کا مطالعہ کیا گیا ہے۔قیام پاکستان سے پہلے کی آپ بیتیوں میں نواب سلطان جہاں بیگم کی آپ بیتی شامل ہے۔جس کے تین حصے ہیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی خود نوشت ان کے خاندانی حالات، ان کے طرز عمل ان کی علم دوستی، اردو نوازی، تعلیم نسواں اور خاص طور پر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے سلسلے میں ان کی خدمات بحیثیت چانسلر اور ان کے معمولات زندگی پر مشتمل ہے۔ نیرنگی بخت وزیر سلطان بخش کی مختصر خود نوشت ہے۔ کتاب کا محور ان کی اپنی ذات ہے۔ جس میں ان کے آباؤاجداد کی شان وشوکت اور ان کی ازدواجی زندگی کے تذکرے ہیں۔اس کے علاوہ اس دور کی سماجی اور سیاسی زندگی جھلکتی ہے۔ خواتین خود نوشت نگاروں میں ایک اہم نام بیگم انیس قدوائی کا بھی ہے۔ان کی خود نوشت آزادی کی چھاؤں میں پاکستان کے قیام اور تقسیم کے دوران ہونے والے فسادات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ سلسلہ روزو شب صالحہ عابد حسین کی سفر حیات کی کہانی ہے۔اس آپ بیتی میں انہوں نے اپنی زندگی کی سچائیوں اور پانی پت کے ماحول کو دلچسپ اور شگفتہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ڈگر سے ہٹ کر میں سعیدہ کی زندگی کے علاوہ بھوپال شہر کی تاریخی و تہذیبی، سیاسی و سماجی اہمیت کی تفصیلات ملتی ہیں۔ جنت سے نکالی ہوئی حوا نفیس بانو شمع کی خود نوشت ہے۔جس میں ان کی پوری زندگی کے غم والم کی

داستان ہے۔ کاغذی ہے پیرہن میں عصمت چغتائی نے اپنی اس آپ بیتی میں زندگی کے احوال و واقعات کے علاوہ معاشرے کی تلخ سچائیوں کو بھی بے نقاب کیا۔ سیدی ٹکٹ امرتا پریتم کی خود نوشت ہے۔ یہ آپ بیتی مصنفہ کی عالمگیر شخصیت کے حوالے سے اہم ہے۔ اس کے علاوہ دیگر خواتین مصنفین کی آپ بیتیوں میں ادراک ذات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جن میں عذرا عباس، ساجدہ زیدی، حمیدہ سالم اور شائستہ سہروردی شامل ہیں۔ یہ آپ بیتیاں اپنے اپنے عہد کے سماج کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔

ادا جعفری اور کشور ناہید کا تعلق بیسویں صدی کے نصف آواخر اور اکیسویں صدی کے آغاز سے ہے۔ یہ دور خواتین کے حوالے سے بیداری اور شعور و آگہی کا دور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کی تعلیم یافتہ خواتین میں شعور و آگہی اس سے پہلے کے ادوار کی نسبت زیادہ نظر آتا ہے۔

ادا جعفری اپنے عہد کی ایک باشعور اور خواتین کے حقوق کی نمائندہ شاعرہ ہیں۔ انھوں نے جس دور میں پرورش پائی وہ خواتین کی تعلیم و تربیت اور ان کی معاشرتی حیثیت کے اعتبار سے عبوری دور تھا۔ کیونکہ ایک طرف قدیم روایات پر کاربند گھرانے خواتین کو گھر کے اندر مقید رکھنے کے حق میں تھے تو دوسری جانب کچھ تہذیب یافتہ گھرانوں میں عورتوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ دی جا رہی تھی۔ ایسے میں ادا جعفری ایک ایسے متوازن ماحول مین پرورش پا رہی تھیں جہاں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت گناہ تو نہیں تھی لیکن انھیں مردوں کے برابر حقوق دینے کی بات بھی قابل قبول نہیں تھی۔ جو رہی سو بے خبر رہی ایک ایسی آپ بیتی ہے جس میں شاعرہ نے اپنے عہد کے تناظر میں عورت کی معاشرتی حیثیت اور شناخت کو موضوع بنایا ہے۔

دوسری آپ بیتیاں بری عورت کی کتھا اور شناسائیاں رسوائیاں کے عنوان سے ہیں۔ ان آپ بیتیوں میں کشور ناہید نے اپنے عہد کی عورت کو اس کے معاشرتی مقام اور تشخص کے تناظر میں جانچنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے معاشرے کا ایک عمومی رویہ ہے کہ عورت کو مجبور اور بے بس چیز ہے، جس کو قدم قدم پر مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم اگر حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو معاشرہ مرد اور عورت دونوں کی کل سے ترتیب پاتا ہے۔ اس نظر سے تو مرد بھی عورت کے بغیر کہیں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہمارے نام نہاد سماجی ضوابط اس بات کو صرف عورت کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ نتیجتاً عورت کا معاشرتی مقام ایک دوسرے درجے کی مخلوق کا سا ہو جاتا ہے۔

عورت جتنی بھی باشعور ہو جائے اور پڑھ لکھ کر سمجھ بوجھ حاصل کر لے اس کا معاشرہ اس کے فیصلے اور سوچ کو اہمیت نہیں دیتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اکیسویں صدی مین اتنی ترقی کرنے کے باوجود بھی پدرسری نظام سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے۔ پدرسری نظام محض ایک سوچ کا نام نہیں بلکہ یہ ہمارا پورا نظام حیات ہے جس نے معاشرے کی

عورت کو مفلوج بنا کر اس کی حیثیت ثانوی کر دی ہے۔

مقالے کے باب سوم میں انہیں معروضی رویوں اور انفرادی تشخص کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ عورت کے حوالے سے ان دونوں رویوں کی بہترین عکاسی ان دونوں شاعرات کی آپ بیتیوں میں دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ دونوں شاعرات کی شاعری میں بھی عورت کے حوالے سے معاشرے کے معروضی رویوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ تاہم شاعری میں براہ راست ان رویوں کا اظہار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے ان دونوں خواتین شاعرات کی آپ بیتیوں میں ان رویوں اور انفرادی تشخص کا حوالہ کھل کر سامنے آتا ہے۔ آپ بیتیوں میں دونوں شاعرات نے اپنی زندگی کے واقعات و تجربات سے ان رویوں کا اظہار کیا ہے، جس سے عورت کا انفرادی تشخص کا حوالہ زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

کشور ناہید نے بری عورت کی کتھا میں پیدائش سے لے کر موت تک ایک عورت کی زندگی کی مشکلات کو بیان کیا ہے۔ یہ مشکلات اس کے معاشرے کی پیدا کردہ ہیں۔ عورت کی شناخت اس کی پیدائش کے ساتھ ہی مشکوک ٹھہرتی ہے، جب اسے یہ کہنا شروع کر دیا جاتا ہے کہ یہ عورت ہے، اس کی سوچ اور فہم کا دائرہ محدود ہے۔ یہیں سے اس کی شخصیت کی نفی کا وہ عمل شروع ہوتا ہے جو موت کے بعد بھی اس کے لیے سوالیہ نشان رہتا ہے۔ ان آپ بیتیوں میں عورت کے حوالے سے ایک اور معروضی رویہ یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ معاشرہ عورت کی ہر قسم کی آزادی کو سلب کیے ہوئے ہے۔ اسے اپنے طرزِ زندگی سے لے کر پہننے اوڑھنے حتی کہ زندگی کے ساتھی کے انتخاب میں بھی کسی قسم کی آزادی نہیں دی جاتی۔ جبکہ دوسری طرف اسی معاشرے کا مرد ان سب حوالوں سے اپنی رائے اور مرضی ظاہر کرنے کا اہل ہے۔ یہ وہ دوہرے معاشرتی معیارات ہیں جو عورت کو انسان کی بجائے شے سمجھتے ہیں اور اس کی زندگی کا ہر اختیار اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں۔ کشور ناہید کی دونوں آپ بیتیوں میں ان دوہرے معاشرتی معیارات کے خلاف ایک احتجاجی رویہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

باب چہارم میں دونوں شاعرات کی آپ بیتیوں میں بیان کیے گئے ان سماجی رویوں کا مطالعہ کیا گیا ہے جنھیں عورت ساری زندگی برداشت کرتی ہے۔ ہمارے معاشرے کا یہ عمومی رویہ بن گیا ہے کہ پڑھی لکھی بیوی لائی جائے تاکہ وہ گھر کی معیشیت کا سارا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھالے۔ کشور ناہید اس سماجی رویے کو بہت تلخی سے اپنی آپ بیتی میں بیان کرتی ہیں کہ اگر ایک طرف عورت کا ان پڑھ ہونا تو اس کے لیے ساری عمر کا طعنہ ہے تو دوسری طرف اس کا پڑھا لکھا ایک دوہری اذیت ہے۔ نوکری کرنے کی صورت میں اسے دوہری ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ لیکن اس کے نتیجے میں اسے کہیں بھی سراہنے یا داد دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی بجائے گھریلو معاملات میں ذرا سی کوتاہی اس کے لیے وبال جان بن جاتی ہے۔

ادا جعفری نے اپنی آپ بیتی جو رہی سو بے خبر رہی نے عورت کے حوالے سے ایک نہایت اہم سماجی المیے کو بیان کیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں عزت و غیرت کا معیار صرف عورت ہے۔ اس لیے عورت کو ہر طرح سے پابندیوں اور حدود و قیود میں مقید رکھا جاتا ہے۔ اس کا مقصد خاندان کی عزت و غیرت کو محفوظ رکھنا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس مرد کو غیرت و عزت کے معاملے میں بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہیں سے برائیوں کا آغاز ہوتا ہے، لیکن معاشرہ اور اس کے نام نہاد علمبردار اس بات کو سمجھنے سے ہر گز قاصر ہیں۔

ادا جعفری نے تاریخی تناظر میں تقسیم ہند کے واقعات کو بھی اپنی آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے۔ یہ وہ تلخ دور ہے جس میں عورت سب سے زیادہ ظلم و بربریت کا نشانہ بنی۔ یہاں وہ ان سماجی رویوں کو بے نقاب کرتی ہیں جو بظاہر عورت کے محافظ کہلاتے ہیں لیکن حالات کے اس موڑ پر یہی عورت تن تنہا عصمت دری، خونی رشتوں کی لاتعلقی اور لاچاری جیسے سنگین رویوں سے دوچار ہوئی۔ اس وقت اس عورت کو تحفظ دینے والے ہی اصل ظالم بنے کھڑے تھے اور عورت کو ان سب قربانیوں کے صلے میں تنہا چھوڑ دیا گیا۔

کشور ناہید کی آپ بیتیوں میں ایک ایسی عورت سامنے آتی ہے جو مختلف معاشرتی رسوم و رواج میں جکڑی ہوئی ہے۔ اس کے پاس اپنے لیے کوئی وقت نہیں۔ اگر وہ زندگی کے کسی قدم پر اپنی ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لیے کوئی قدم اٹھانے کا سوچتی بھی ہے تو اس کی مشکلات کو مزید بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ساری زندی خود سے جڑے رشتوں کی پرورش میں جُتی رہتی ہے اور اپنی زندگی یا اپنی سہولت کے بارے میں سوچنا بھی اسے جرم محسوس ہوتا ہے۔

کشور ناہید نے ہندوستانی معاشرے سے آگے بڑھ کر دیگر معاشروں میں عورت کے حوالے سے سماجی رویوں کو بیان کیا ہے۔ دنیا کا کوئی معاشرہ ایسا نہیں جو عورت کے ساتھ برابری یا مساوات کا سلوک کرنے کا قائل ہو۔

مجموعی طور پر دونوں شاعرات کی آپ بیتیوں میں عورت کی شناخت اور اس کے تشخص کے حوالے سے جو سوال اٹھائے گئے ہیں وہ در حقیقت ہمارے معاشرے کے چہرے پر کنندہ سوالیہ نشان ہیں۔ اتنی صدیوں کا طویل تہذیبی و ثقافتی سفر طے کرنے کے بعد بھی عورت اپنے حقوق اور اپنی ذات کی شناخت کے حوالے سے سرگرداں ہے۔ دنیا کے ہر مذہب، ہر قانون نے عورت کے حوالے سے واضح تعلیمات اور ضوابط بتائے ہیں، تاہم ہمارا پدرسری نظامِ حیات ان میں سے کسی قانون اور کسی ضابطے کو ماننے کو تیار نہیں۔

عمومی طور پر لڑکیوں کو اس بات کا عادی بنا دیا جاتا ہے کہ وہ معاشرے مین اپنی ثانوی حیثیت کو قبول کر لیں، لیکن ادا جعفری اور کشور ناہید چونکہ معاشرے کی تعلیم یافتہ اور حساس خواتین ہیں۔ اس لیے ان دونوں کے ہاں عورت کی ذات اور شناخت کے حوالے سے معاشرتی رویوں کے مخالف ایک احتجاجی رویہ نظر آتا ہے۔ یہ احتجاجی رویہ در

حقیقت ان حقوق کی بازیافت ہے جو فطری طور پر عورت کو معاشرے کا فرد ہونے کی حیثیت سے ملنے چاہییں۔

کتابیات

کتابیات

اختر، سلیم۔ادب اور لاشعور۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

احمد، سیدہ بانو۔ڈگر سے ہٹ کر۔نئی دہلی: سجاد پبلیشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء۔

انور، صبیحہ۔اردو میں خود نوشت سوانح (طبع اوّل)۔لکھنؤ: نامی پریس، ۱۹۸۲ء۔

احمد، ندیم۔بیسویں صدی میں خود نوشت سوانح عمری ۔پٹنہ: خدابخش لائبریری جرنل، ۲۰۰۲ء۔

آزاد، ابوالکلام۔آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی۔لاہور: مکتبہ خلیل، سن ندارد۔

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری (*Oxford English Dictionary*)۔امریکہ: آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، ۱۹۷۰ء۔

بانو، نفیس۔جنت سے نکالی ہوئی حوا۔دہلی: آبشار پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء۔

بیگم، نواب سلطان جہاں۔تزک سلطانی۔بھوپال: مطبع سلطانی، ۱۹۰۳ء۔

بیگم، نواب سلطان جہاں۔گوہر اقبال۔بھوپال: مطبع سلطانی، ۱۹۰۹ء۔

بیگم، نواب سلطان جہاں۔اختر اقبال۔بھوپال: مطبع سلطانی، ۱۹۱۴ء۔

بیگم، وزیر سلطان۔نیرنگی بخت۔جالندھر: ناشر ذکاءاللہ حسینی، ۱۹۴۲ء۔

پریتم، امرتا۔رسیدی ٹکٹ۔لاہور: مکتبہ اردو ادب، ۲۰۰۵ء۔

پروازی، پرویز۔پس نوشت اور پس نوشت۔لاہور: نیا زمانہ پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء۔

تھانیسری، جعفر۔کالا پانی۔لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۶۱ء۔

جعفری، ادا۔جو رہی سو بے خبری رہی۔کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۵ء۔

چغتائی، عصمت۔کاغذی ہے پیرہن۔نئی دہلی: پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ، ۱۹۹۴ء۔

حق، افضل۔میرا افسانہ۔لاہور: تاج کمپنی لمیٹڈ، ۱۹۴۳ء۔

حسین، سید شرافت۔عورت مذہب اور حکومت۔لاہور: نسیم بک ڈپو، سن ندارد۔

حسین، صالحہ عابد۔سلسلہ روز و شب۔دہلی: مکتبہ جامعہ، ۱۹۸۴ء۔

زیدی، ساجدہ۔نوائے زندگی۔دہلی: اردو اکادمی، ۲۰۱۲ء۔

سلیم، شبانہ۔اردو میں خواتین کی خود نوشت سوانح عمریاں تجزیاتی مطالعہ)، ۲۰۱۵ء۔

سید، شاداب۔اردو میں خواتین کی خود نوشتیں اور سماجی سروکار۔ ممبئی: حسن پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

سالم، حمیدہ۔شورش دوراں۔ دہلی: ادب پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء۔

سالم، حمیدہ۔ہم ساتھ تھے۔ دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۹ء۔

سہروردی، شائستہ اکرام اللہ۔پردے سے پارلیمنٹ تک۔ کراچی: آکسفورڈ س یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۲ء۔

شجاع، حکیم احمد۔خون بہا۔ لاہور: تاج کمپنی لمیٹڈ، ۱۹۴۹ء۔

عالم، محمد نوشاد۔اردو خود نوشت سوانح حیات آزادی کے بعد۔ دہلی: کلاسک آرٹ پریس، ۲۰۱۱ء۔

علی، رضا۔اعمال نامہ۔ دلی: ہندوستان پبلیشرز، ۱۹۴۳ء۔

عبداللہ، سید۔وجہی سے عبدالحق تک۔ لاہور: مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۷۷ء۔

علوی، وہاج الدین۔اردو خود نوشت فن اور تجزیہ۔ دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ، ۱۹۹۸ء۔

فاطمہ، الطاف۔اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا۔ کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۱ء۔

قدوائی، انیس۔آزادی کی چھاؤں میں۔ نئی دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ، ۱۹۸۰ء۔

قاسم، غفور شاہ پاکستانی شناخت کی نصف صدی۔ راولپنڈی: ریز پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء۔

موہانی، حسرت، قید فرہنگ۔ فیصل آباد: طارق اکیڈمی، ۱۹۸۷ء۔

ناہید، کشور۔بری عورت کی کتھا۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

ناہید، کشور۔شناسائیاں رسوائیاں۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء۔

ندوی، ابوالحسن علی۔حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب۔ لکھنؤ: مکتبہ اسلام گوئن روڈ، ۱۹۸۲ء۔

نظامی، خواجہ حسن۔آپ بیتی۔ دہلی: پرنٹنگ ورکس، ۱۹۲۲ء۔

ہاشمی، رفیع الدین۔اصناف ادب۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔

مقالات:

ارشد، نعیم۔کوہاٹ میں آپ بیتی کی روایت۔ مقالہ ایم فل اردو، اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، ۲۰۰۹ء۔

جمیل، عصمت۔اردو افسانے میں عورت کا تصور، غیر مطبوعہ مقالہ، برائے پی ایچ ڈی، شعبہ اردو، بہاؤالدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان، ۱۹۹۷ء۔
خانم، ریحانہ۔اردو آپ بیتی کا فن مقالہ برائے ایم اے اردو پنجاب یونی ورسٹی، ۱۹۶۲ء۔
قسیم، اظہر۔اردو کی آپ بیتیاں:تحقیقی و تنقیدی جائزہ۔لاہور:جی سی یونی ورسٹی، ۲۰۰۳۔

رسائل:

توحید، عرفان/اختر، پروین۔کشور ناہید کی آپ بیتی "شناسائیاں رسوائیاں" سیاسی و سماجی صورت حال کا جائزہ، زبان و ادب ششماہی مجلہ، شمارہ:۲۱ جولائی تا دسمبر ۲۰۱۸ء۔
شمس، صائمہ۔ادا جعفری:"ایک رجحان ساز غزل گو بہ حوالہ تصور حیات و ممات" سہ ماہی مجلہ۔اورینٹل کالج میگزین، شمارہ:۳ جولائی تا دسمبر ۲۰۱۵ء۔
قریشی، عبدالمجید۔آپ بیتی اردو ادب میں (الزبیر، آپ بیتی نمبر)، ۱۹۶۴ء۔

ویب سائٹس(Websites):

https://en.m.wikipedia.org>pedia بتاریخ ۱۵ اگست ۲۰۲۱ء، بوقت ۶:۳۳۔
https://www.rekhta.org/ebooks?lang=ur بتاریخ ۱۰ اگست ۲۰۲۱ء بوقت ۱۲:۴۵۔

International Islamic Univ.
CENTRAL LIBRARY ISLAMABAD